آنکھ مچولی

بچوں کا عالمی دن _ نظمیں اور کہانیاں

شاعر مشرق کی زندگی کی جھلکیاں

نومبر ۱۹۹۲ء

آگ کے سمندر میں چھلانگ
لگانے کی حیرت ناک تصویریں

مچھلیاں

نیا
بلو بینڈ
مارجرین
Blue Band
MARGARINE
WITH VITAMIN A&D
لذّت کے ساتھ... صحت بھی!

نومبر 92

bubble up
ٹھنڈا ٹھنڈا
فرحت بخش
bubble up junior
bubble up
175 مِلی لیٹر کی
نئی بوتل میں
Bubble up
Contents 175 mL
Its a sign of good taste
مہران باٹلرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
MBL

MPL

آدابِ سفر

اپنے عزیزوں کو لینے یا رخصت کرنے
جب بھی آپ ریلوے سٹیشن آئیں تو
پلیٹ فارم ٹکٹ لینا نہ بھولیں ہو سکتا
ہے کہ بعد میں آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا
پڑے

ایک قابل اعتماد نام پاکستان ریلوے

محکمہ تعلقات عامہ

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد ۷، شمارہ ۵ جمادی الاول/جمادی الثانی ۱۴۱۲ھ نومبر ۱۹۹۱ء

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیر اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول

ایم اے فاروقی

مشاورت

مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیر اعزازی

طاہر مسعود

مجلس ادارت

منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

• ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۰-اے پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ ۷۴۸۰۰ فون : ۱۱۵۸۷

ناشر ، ظفر محمود شیخ طابع ، زاہد علی مطبع ، لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

قیمت دس روپے
۷ درہم، ۷ ریال

جی ہاں! آنکھ مچولی کا مقابلہ آنکھ مچولی ہی سے ہے

اپنی روایات کو ہم خود ہی آگے بڑھاتے ہیں

کرکٹ اسپیشل، قہقہہ نمبر، خوفناک نمبر، حیرتناک نمبر، اطفال نمبر، عالمی ادب نمبر اور کشمیر نمبر

کے بعد اب

آنکھ مچولی کی ایک نئی اور انوکھی پیش کش

جنوری ۹۳ء
میں منظرِ عام پہ
آرہا ہے

ایجادات نمبر

روئے زمین پر انسان نے آج تک جتنی اہم چیزیں ایجاد کی ہیں ان کی دلچسپ حیرت انگیز اور سچی کہانیاں

سائنس کی سائنس، کہانی کی کہانی

یہ چیزیں کیسے ایجاد ہوئیں؟

پہیہ، انجن، بلب، کاغذ، ریل گاڑی، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ٹیلی گراف، کار، ریڈیو، ٹیلی وژن، راکٹ، ایٹمی بجلی گھر، دوائیں اور دیگر اشیاء —

خصوصی شمارہ میں پڑھیے

لفظ لفظ تحقیق — حرف حرف حقیقت

آپ بھی لکھیے

اگر آپ کسی سائنسی ایجاد کی کہانی لکھنا چاہیں تو ضرور لکھیے — لیکن جس کتاب سے معلومات حاصل کریں اس کا حوالہ دینا نہ بھولئے —

ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ دینا آنکھ مچولی کی روایت ہے

حسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے — ادارہ — ۸

ماہِ رواں کی پہلی بات — ظفر محمود شیخ — ۹

تم جنت کے پھول ہو بچو (نظم) — پروفیسر عنایت علی خان — ۱۰

عجیب سودا — ایم مسعود ذکی — ۱۱

شاعرِ مشرق کی زندگی — طاہر مسعود — ۱۴

بر ٹیل اسٹار — کلیم چغتائی — ۲۱

بُری لڑکی — شازیہ فرحین — ۲۴

اسد کے پھول — کلیم چغتائی — ۲۸

گیتوں کی کہانی — جوانا کولا چینیس کا — ۳۳

عالمی فُٹ بال ٹرافی — علی جبران — ۳۹

بُوجھو تو جانیں — ادارہ — ۴۲

سیلاب — محمد عمر احمد خان — ۴۵

چیزوں کی کہانی — آصف فرخی — ۵۱

اسٹالن — فواد النظفر خان — ۵۵

مداوا — علی اکمل تصور — ۶۰

غریب لڑکا (نظم) — ناصر علی منصوری — ۶۴

ایڈیٹر کی میز پر — سیما صدیقی — ۶۵

بخدمت جناب — خطوں کے جواب — ۷۱

(نظم) ہم سب ایک وطن کے باسی — محمد افضل سراج — ۷۵

بکرا بیتی — عنبر بن آمنہ صدیقی — ۷۶

اُلّو نہیں سمجھتے — منیر احمد راشد — ۷۸

بُل فائٹنگ — سید کاشان جعفری — ۸۲

گھر بیٹھے ٹیبل لیمپ بنایئے — طیب جمیل قریشی — ۸۷

پالش والا — حامد علی شاہد — ۹۰

گُدگُدے — لطائف — ۹۷

آسمان نیلا کیوں ہے؟ — شگفتہ شمیم — ۱۰۱

کرشمہ — اظہر نیاز — ۱۰۳

(نظم) سونے کی اینٹیں — عبدالقادر — ۱۱۰

درِ حیرت — ایاز محمود — ۱۱۲

مٹکو کا مٹاپا — ۱۱۶

قلم قتلے — ننھی تحریریں — ۱۱۹

کترنیں — لطائف / کارٹون — ...

تاریخ کے دریچے سے

خلیفہ مہدی کے وزیر اعظم ابو خالد کا انتقال ہو چکا تھا اور اب ان کا بیٹا احمد، مفلس و تباہ حال تھا۔ احمد نے باپ کی زندگی میں جاہ و حشم، دولت و ثروت کے دن دیکھے تھے۔ ایک دن احمد خلیفہ ہارون رشید کے وزیر یحییٰ کے پاس پہنچا اور اپنی تباہ حالی کی طرف انہیں متوجہ کیا۔ یحییٰ نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور احمد کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ احمد یحییٰ کی سرد مہری پر حیران رہ گیا۔

یحییٰ، احمد کے پاس سے اٹھ کر اپنے لڑکے افضل کے پاس آیا اور اس سے بولا۔ "بیٹا! وہاں احمد بیٹھا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ میں ذرا دربار تک جا رہا ہوں۔ واپس آ کر تمہیں احمد کے سامنے اس کے باپ کا ایک دلچسپ واقعہ سناؤں گا۔"

یحییٰ دربار سے واپس آیا تو افضل، نوجوان احمد کو لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یحییٰ نے چند اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا۔ "جب اس نوجوان کا باپ ابو خالد خلیفہ مہدی کا وزیر اعظم تھا تو اس وقت ہماری حالت بہت خراب تھی۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے گھر کا سامان تک بیچ دینا پڑا تھا۔ ایک دن میں نے ابو خالد کو اپنی حالت بتائی تو وہ کوئی جواب دیئے بغیر اٹھ کر چلا گیا تھا۔ گھر آ کر میں نے اس کی بے توجہی کا ذکر کیا تو گھر والے مجھ پر طعنہ زن ہوئے کہ میں نے ناحق ہاتھ پھیلایا اور خاندان کی عزّت خاک میں ملا دی۔

دوسرے روز ابو خالد نے اپنا آدمی بھیج کر مجھے بلایا۔ میں گیا، اس نے کچھ کاغذات میرے حوالے کئے، گھر آ کر میں نے وہ کاغذات کھولے تو ان میں ایک فرمان درج تھا کہ یحییٰ کو کوفے کا گورنر مقرر کیا جاتا ہے۔ میں فوراً اپنے عہدے پر چلا گیا تھا اور آج یہ دن ہے کہ ترقی کرتے کرتے وزیر بن گیا ہوں۔" اتنا کہہ کر یحییٰ چپ ہو گیا۔ پھر اس نے کہا،

"آج میرے مُربّی کا بیٹا میرے پاس آیا ہے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے باپ کا احسان کس طرح چکاؤں۔ میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر اس نوجوان کو اپنی جگہ مقرر کر رہا ہوں۔"

ماہِ رواں کی پہلی بات

ملک بھر کے بچوں کو یہ خبر پڑھ کر یقیناً خوشی ہوئی ہوگی کہ اب ہر سال ۲۰/ نومبر کو پاکستان میں بچوں کا عالمی دن منایا جائے گا۔ یوں تو دن اور ہفتہ منانا اب رسمی سی بات ہو گئی ہے۔ کبھی ہفتہ صفائی منایا جاتا ہے تو کبھی ہفتہ خوش اخلاقی۔ مزدوروں اور عورتوں کے عالمی دن منانے کی ریت بھی پڑ چکی ہے۔ لیکن دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ بار بار ہفتہ صفائی منانے کے باوجود ہمیں اپنے گلی محلّوں اور در و دیوار کو صاف ستھرا رکھنے کی عادت نہیں پڑی۔ اسی طرح ہر سال مزدوروں کا عالمی دن منانے کے بعد بھی مزدوروں کے مسائل مستقل بنیادوں پر حل نہیں کئے جا سکے۔ لہٰذا اب ہر سال بچوں کا دن منانے کے فیصلے سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ بچوں کے دکھ درد اور ان کی شکایتیں دور ہو جائیں گی لیکن اس کے باوجود یہ بات ضرور خوش آئند ہے کہ کم سے کم سرکاری سطح پر بچوں کو اور ان کے مسائل کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ چینی کہاوت ہے کہ ہزار میل کا سفر پہلے قدم ہی سے طے کیا جاتا ہے۔ ملک میں بچوں کے اَن گنت مسائل ہیں جو حکومت اور معاشرے کی توجہ چاہتے ہیں۔ یہ ایک لحاظ سے بہت اچھا ہے کہ اس سال بچوں کے عالمی دن کا ایک موضوع مقرر کر لیا گیا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت واضح ہے۔ صحت بخش اور صاف ستھرے ماحول ہی میں صحت مند جسم و جاں اور صحت مند خیالات رکھنے والی نسل پروان چڑھتی ہے۔ لیکن اس موقع پر ہم یہ کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ عالمی دن کے موقع پر رسمی تقریبات منعقد کرنے اور ان میں رسمی زبانی کلامی تقریریں کرنے سے بچوں کا کچھ بھلا نہ ہوگا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ معاشرے میں بیداری پیدا کی جائے، بچوں میں ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کا احساس بیدار کیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ سارے کام حکومت کے کرنے کا نہیں ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ حکومت جب کسی مسئلے کو اہمیت دیتی ہے تو اس کا اثر سارے معاشرے پر پڑتا ہے۔ مختلف رفاہی، سماجی اور مذہبی تنظیموں اور جماعتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور آج کی نسل کو ایک صحت بخش ماحول فراہم کرنے کے لئے اپنی ذمہ داریاں پوری کریں، کیونکہ اگر ہمیں اپنا کل سنوارنا ہو تو اس کی فکر آج ہی سے شروع کر دینی چاہئے۔ ورنہ آنے والا کل ہمارے آج سے کسی طرح بہتر نہ ہوگا۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

بچّے جنّت کے پھول ہوتے ہیں (الحدیث)

تم جنّت کے پھول ہو بچّو

پروفیسر عنایت علی خان

تم سے ہے ہر گھر کی رونق، تم جنّت کے پھول
تم جنّت کے پھول ہو بچّو! تم جنّت کے پھول

تم جو ہنسو تو گھر میں سب کے دِل کی کلی کِھل جائے جیسے ان کو دنیا کی ساری دولت مل جائے
تم کو دُکھ میں دیکھ کے غم سے سب کا دِل ہِل جائے راحت تم کو پہنچانے میں خود کو جائیں بھُول
تم جنّت کے پھول ہو بچّو! تم جنّت کے پھول

دِل میں گھر کر جائیں تمہاری بھولی بھالی باتیں بچپن کی معصوم ادائیں قدرت کی سوغاتیں
ایک تمہارے دم سے روشن دن سے سوا ہوں راتیں الفت تم سے فرماتے تھے حق کے پیارے رسولؐ
تم جنت کے پھول ہو بچّو! تم جنت کے پھول

انشاء اللہ آگے چل کر تم گلشن مہکاؤ گے قوم کا نام کرو گے روشن اور قسمت چمکاؤ گے
سب کی آنکھ کے تارے بن کر سب کا دل پرچاؤ گے ہو جائے گی انشاء اللہ میری دعا مقبول
تم جنّت کے پھول ہو بچّو! تم جنّت کے پھول

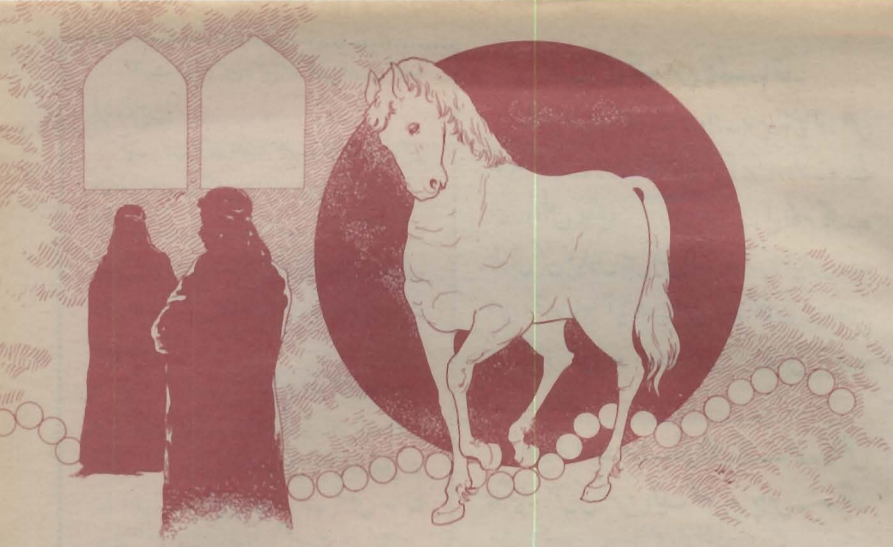

عجیب سودا

ایم مسعود ذکی

تاریخ اسلام کا ایک روشن ورق

میلہ بڑا شاندار تھا، ضرورت کی ہر چیز موجود تھی مگر غلام کی نظریں اپنی مطلوبہ چیز کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ آج آقا نے حکم دیا تھا کہ کوئی گھوڑا پسند کر کے لائے۔ صبح سے دوپہر ہونے کو آئی تھی مگر ابھی تک اسے کوئی ایسا گھوڑا نظر نہیں آیا جو اس کے آقا کی سواری کے شایانِ شان ہو۔ میلے میں بھٹکتا ہوا غلام ایک طرف جا نکلا اور پھر اس کی نظریں ایک شاندار گھوڑے پر پڑیں جو سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا، بڑی شان سے کھڑا تھا۔ غلام کو وہ گھوڑا بہت اچھا لگا۔ اس نے دھوپ میں گھوڑے کی چمکتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا قیمت ہے اس گھوڑے کی؟"

"تین سو درہم۔" گھوڑے کے مالک نے مختصر جواب دیا۔ اس کے لہجے کی تھکن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے ابھی تک اپنا مطلوبہ گاہک نہیں ملا اور نہ ہی ملنے کی امید ہے۔

غلام قیمت سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ "کیا پتا آقا ایک سواری کے گھوڑے کی اتنی قیمت دینا پسند کریں گے یا نہیں، مگر کیا حرج ہے اگر وہ گھوڑا ایک نظر دیکھ لیں۔ شاید پسند کر لیں۔"

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوف فرماتے ہیں!

ایک رات خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں بلوایا اور فرمایا "ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ مدینہ کے دروازے پر ایک قافلہ پہنچا ہے میں ڈرتا ہوں کہ یہ جو قافلہ اترا ہے اس کے اہل قافلہ سوگئے تو کہیں خدانخواستہ ان کے یہاں چوری نہ ہو جائے۔"

یہ کہہ کر فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ روانہ ہوئے تو میں بھی ان کے ہمراہ ہولیا۔ پھر جب دونوں قافلے کے قریب پہنچے تو عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "میرا خیال ہے کہ اب تمہیں سو جانا چاہئے" اس کے بعد فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ساری رات پہرہ دیتے رہے۔ حتیٰ کہ فجر کی اذان ہوئی۔ اہلِ قافلہ بیدار ہوئے اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز فجر کی ادائیگی کے لئے چلے آئے۔

(مرسلہ: ایم اسحاق، راجن پور)

غلام بولا "دیکھو اگر تم پسند کرو تو میرے ساتھ میرے آقا کے گھر چلو۔ خریدنے سے پہلے ضروری ہے کہ آقا ایک نظر پہلے خود اس کو دیکھ لیں۔"

گھوڑے کا مالک صبح سے پریشان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید گھوڑے کی قیمت زیادہ ہے اس لئے ابھی تک اسے کوئی گاہک نہیں مل سکا۔ جو بھی آتا گھوڑے کو دیکھتا قیمت پوچھتا اور راہ لیتا۔ اب غلام کی باتوں سے، اسے امید ہوئی کہ شاید کام بن جائے، چنانچہ وہ گھوڑے کی لگام پکڑے غلام کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

سورج ابھی تک سر پر چمک رہا تھا۔

غلام اپنے آقا کے دروازے پر پہنچا اور اس کو باہر کھڑے رہنے کا اشارہ کرتا ہوا دروازے کے اندر داخل ہوگیا۔ سوداگر گھوڑے کی لگام پکڑے خوش کن خیالوں میں مگن تھا۔ وہ اپنے خیالوں سے اس وقت باہر آیا جب اس کے کانوں میں غلام کی آواز آئی جو اسے اندر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

سوداگر اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے اندر داخل ہوگیا۔ اس کی نظریں ایک شخص پر پڑیں۔ سوداگر نے آنکھیں ملانے کی کوشش کی مگر اس کی نظروں میں ایسی کوئی بات تھی کہ سوداگر باوجود کوشش کے آنکھ نہ ملا سکا۔ اس نے اپنی نظریں نیچے جھکالیں۔

اجنبی نے گھوڑے کو ایک نظر دیکھا اور سوداگر سے اس کی قیمت دریافت کی۔

"تین سو درہم۔" سوداگر نے نہایت ادب سے ڈرتے ڈرتے اپنا جواب دُہرا دیا۔

اس کا خیال تھا کہ اجنبی یقیناً اتنی زیادہ قیمت پر گھوڑا لینا پسند نہ کرے گا۔ اس نے کن انکھیوں سے اجنبی کی طرف دیکھا۔ اجنبی کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیا تم اس گھوڑے کے چار سو درہم لینا پسند کرو گے؟" اجنبی بولا۔

سوداگر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"پانچ سو درہم" اجنبی مسکراتے ہوئے

بولا۔

سوداگر کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اجنبی اپنی بولی بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔

"سات سو درہم۔"

سوداگر کے دل میں خیالات کا ایک طوفان موجزن تھا۔ وہ سوچ رہا تھا یا الٰہی یہ کون ہے جو بجائے قیمت کم کرانے کے اور بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ کیا اسے اپنی رقم ضائع ہونے کا بھی غم نہیں۔

اجنبی نے اسی اطمینان سے بولی بڑھائی۔

"آٹھ سو درہم"

سوداگر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے گھوڑے کی لگام اجنبی کے حوالے کر دی مگر اس کا دل اس راز سے اب تک ناآشنا تھا کہ اجنبی بجائے بولی کم کرانے کے اور بڑھاتا کیوں جا رہا ہے؟ اجنبی نے جیسے اس کے خیالات پڑھ لئے، گھوڑے کی لگام اس نے غلام کے سپرد کی اور سوداگر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا:

"گھوڑا اسی قیمت کا مستحق تھا مگر تمہیں اس کا اندازہ نہ تھا، مجھے گوارا نہیں ہوا کہ میں تمہاری لاعلمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گھوڑا کم قیمت پر خرید لوں، لہٰذا میں گھوڑے کی قیمت بڑھاتا چلا گیا۔ تم بے خطر واپس چلے جاؤ۔"

سوداگر رقم لے کر الٹے پاؤں واپس نکل گیا اور باہر نکل کر اسے پتا چلا کہ یہ صحابی رسولؐ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کا مکان ہے۔

علم اور دولت

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

"علم دولت سے بہتر ہے۔ کیونکہ.....

"علم انبیاء کا ورثہ ہے اور دولت فرعون اور نمرود کا ترکہ۔

"دولت کی حفاظت انسان کرتا ہے اور علم انسان کی۔"

"دولت کے مالک کے سب لوگ شدید مخالف ہوتے ہیں اور علم سے آراستہ شخص کے سب لوگ دوست ہوتے ہیں۔"

"دولت خرچ کی جائے تو کمی ہوتی ہے۔ علم خرچ کیا جائے تو اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔"

"علم انسان میں شائستگی اور فیاضی پیدا کرتا ہے اور دولت انسان میں کنجوسی اور بد مستی پیدا کرتی ہے۔"

"علم کی چوری نہیں ہو سکتی لیکن دولت چوری ہو سکتی ہے۔"

"طویل مدت گزرنے پر بھی علم بدستور رہتا ہے جبکہ دولت زنگ خوردہ ہو کر خراب ہو جاتی ہے۔"

"علم بے حد و حساب ہے لیکن دولت محدود بھی ہوتی ہے اور اس کا حساب کتاب بھی رکھا جا سکتا ہے۔"

"علم دماغ کو روشن کر دیتا ہے۔ جبکہ دولت اندھا کر دیتی ہے۔"

"علم انسانیت کو پیدا کرتا ہے اور اس سے خدا کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے لیکن دولت غرور پیدا کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے بیگانہ بنا دیتی ہے۔"

(مرسلہ: ایم اسحاق، رحیم یار خان)

شاعرِ مشرق کی زندگی

طاہر مسعود

والد کا خواب

علامہ اقبال کی پیدائش سے پہلے ان کے والد شیخ نور محمد نے ایک خواب دیکھا۔ وہ بیان کرتے ہیں "میں نے دیکھا ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ اوپر فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگ برنگے پروں والا پرندہ اڑ رہا ہے۔ اس کی دل کشی اور دل فریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو اٹھا اٹھا کر اس پرندے کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آخر وہ خوبصورت پرندہ ایک دم فضا سے اترا اور میری گود میں آن گرا۔"

اس خواب کی شیخ محمد نے یہ تعبیر نکالی کہ ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہو گا جو اسلام کی خدمت کرے گا اور ناموری حاصل کرے گا۔ والد کا خواب سچا ثابت ہوا اور ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو اقبال پیدا ہوئے۔

بچپن

اقبال بے حد ذہین تھے۔ انہیں کھیل کود کا بھی بہت شوق تھا۔ شرارتیں بھی کرتے تھے۔ کبوتر پالنے، پتنگ اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے

میں وہ پیش پیش رہتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی لکھنے پڑھنے سے بھی لگاؤ تھا۔ رات کو نیند میں اٹھ اٹھ کر پڑھتے رہتے۔ ایک دفعہ آدھی رات کو والدہ کی آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ اقبال دیئے کی روشنی میں بیٹھے اسکول کا کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے دو ایک آوازیں دیں لیکن اقبال نے کوئی جواب نہیں دیا انہوں نے اٹھ کر شانوں سے پکڑ کر ہلایا اور کہا "اقبال آدھی رات کو کیا پڑھ رہے ہو۔ اٹھو، سو جاؤ، صبح کام کر لینا۔" اقبال کسمسائے اور جواب دیا "بے جی! سو یا ہوا تو ہوں۔" اگلی صبح جب رات کے واقعے کا والدہ نے پوچھا تو اقبال نے لاعلمی ظاہر کی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ریاضی کے جو سوالات وہ نیند میں حل کرتے وہ بالکل درست ہوتے۔ اس واقعے کے بعد سے والدہ اکثر رات کو کئی کئی بار اٹھ کر دیکھتیں اور انہیں اسی حالت میں پاتیں اور اٹھ کر سلا دیتیں۔ آہستہ آہستہ اقبال کی یہ عادت چھوٹ گئی۔

شاعری سے دلچسپی

اقبال کو بچپن ہی سے شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اکثر بازار سے منظوم قصے (وہ قصے جو کسی نظم میں بیان کئے گئے ہوں۔) لا کر گھر اور محلے کی عورتوں کو ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ ان کی آواز بہت شیریں تھی۔ قصہ سناتے سناتے اپنی طرف سے بھی کسی مصرع کا اضافہ کر دیتے تھے۔ اور وہ مصرعہ ایسا خوبصورت ہوتا کہ عورتیں بے ساختہ داد دیتیں۔ اقبال کی عمر اس وقت بمشکل دس بارہ برس تھی۔

قرآن پاک کا مطالعہ

اقبال کے والد ایک مذہبی انسان تھے۔ ان کے استاد مولوی میر حسن کو بھی دین سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان دونوں بزرگوں کی تربیت سے اقبال کو بھی اپنے دین سے محبت ہو گئی تھی۔ مڈل اور انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخل ہوئے تو ان کا معمول تھا کہ ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ قرآن کے مطالعہ نے ان کی شخصیت میں انقلاب برپا کر دیا۔ ایک دن والد نے انہیں نصیحت کی کہ بیٹا! قرآن کو اس طرح پڑھا کرو جیسے یہ تم ہی پر نازل ہوا ہے۔

شاعری کا آغاز

زمانہ طالب علمی ہی میں اقبال شعر کہنے لگے تھے۔ سیالکوٹ میں ایک مشاعرہ ہوتا تھا۔ اس کے لئے اقبال کبھی کبھی غزل کہتے تھے۔ ان دنوں مرزا داغ دہلوی کی شاعری کا بہت شہرہ تھا۔ اقبال نے انہیں خط لکھا اور اپنی چند غزلیں اصلاح کے لئے بھیجیں۔ داغ نے چند غزلوں کی اصلاح کے بعد لکھا کہ آپ کے کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ بعد میں جب اقبال بڑے شاعر کی حیثیت سے تسلیم کر لئے گئے تو داغ دہلوی اس بات پہ فخر کیا کرتے تھے کہ اقبال ان کے شاگرد رہے ہیں۔ اقبال بھی داغ کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر علامہ اقبال ایک دفعہ ایک درویش کے پاس گئے۔ ان سے دعا کی استدعا کی۔ درویش نے پوچھا۔

"دولت چاہتے ہو؟"

علامہ نے فرمایا "میں درویش ہوں دولت کی ضرورت نہیں۔"

درویش نے کہا۔ "عزو جاہ مانگتے ہو؟"

جواب دیا۔ "خدا نے کافی بخش دی ہے۔"

درویش نے پھر پوچھا "خدا سے ملنا چاہتے ہو؟"

علامہ بولے "سائیں جی کیا کہہ رہے ہیں۔ میں بندہ ہوں اور وہ خدا۔"

قطرہ اگر دریا میں مل جائے تو قطرہ نہیں رہتا۔ میں قطرے کی حیثیت میں رہ کر دریا بننا چاہتا ہوں۔

یہ سن کر درویش پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی فرمایا۔

"آپ خود آگاہ راز ہیں آپ کو کسی دعا کی ضرورت نہیں۔" (مرسلہ: ہمایوں خورشید بیگ)

پروفیسر آرنلڈ کی شاگردی

اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا تو وہاں انہیں فلسفے کے پروفیسر آرنلڈ کی صحبت ملی۔ آرنلڈ اقبال کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے اور ان سے دوستی کی حد تک بے تکلف ہو گئے۔ آرنلڈ انتہائی لائق استاد تھے۔ انہوں نے اقبال کو بہت محنت اور توجہ سے پڑھایا۔ بعد میں آرنلڈ انگلستان چلے گئے۔ اور اقبال بھی تعلیم کے لئے انگلستان پہنچے تو وہاں استاد اور شاگرد کا یہ رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔ آرنلڈ بھی اقبال کی شاگردی پر فخر اور مسرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔

اقبال کی پہلی ملازمت

فلسفے میں ایم اے کرنے اور طلائی تمغہ حاصل کرنے کے بعد اقبال کو پروفیسر آرنلڈ نے اورینٹل کالج میں ریڈر کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ ان کی تنخواہ ایک سو روپے ماہانہ تھی۔ اس دوران انہوں نے گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج میں بھی چھ چھ ماہ تک پڑھایا۔ اس زمانے میں لاہور سے ایک رسالہ "مخزن" جاری ہوا۔ اسے اقبال کے دوست سر عبد القادر نے نکالا تھا۔ اقبال "مخزن" کے لئے بھی مضامین لکھتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد اقبال تعلیم کے لئے لندن روانہ ہو گئے۔

لندن کی تعلیم

لندن پہنچ کر اقبال نے ٹرنٹی کالج میں داخلہ لیا۔ ٹرنٹی کالج میں دنیا کی بہت مشہور شخصیتوں نے تعلیم پائی تھی۔ یہاں بیکن، بائرن اور ملٹن جیسی علمی اور ادبی شخصیات کی تربیت ہوئی تھی۔ اقبال کو کالج کا علمی کا ماحول ملا تو ان کی صلاحیتیں چمک اٹھیں۔ انہیں یورپ کے فلسفیانہ خیالات سے گہری واقفیت ہوئی۔ اور ان کے تعلقات یورپ کے دانشوروں اور فلسفیوں سے قائم ہوئے۔

ایک واقعہ

لندن میں قیام کے دوران انہیں ایک محفل میں

شرکت کا موقع ملا۔ اس محفل میں ایک عیسائی نے اس موضوع پر لیکچر دیا کہ ہندوستان میں عیسائیت کو کس قدر ترقی ہو رہی ہے۔ لیکچر میں موصوف نے بتایا کہ ہندوستان میں تیس کروڑ انسان بستے ہیں لیکن ان لوگوں کو انسان کہنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ جنگلی اور وحشی ہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے لٹکے ہوئے پردے پر ہندوستانیوں کی تصویریں دکھانا شروع کیں، یہ تصویریں ہندوستان کے جنگلی قبائل کی تھیں۔ مقصد اس لیکچر کا یہ تھا کہ مقرر صاحب کو چندہ دیا جائے تاکہ وہ ہندوستان جاکر ہندوستانیوں کو مہذب بنائیں۔ لیکچر ختم ہوا تو اقبال اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ اقبال نے کہا میں بھی ایک ہندوستانی ہوں اور مجھے دیکھ کر آپ لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے بارے میں جو کچھ مقرر صاحب نے کہا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔ اس کے بعد اقبال نے تیس منٹ تک تقریر کی جس میں انہوں نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کی خوبیوں پر روشنی ڈالی۔ اس تقریر کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقرر موصوف کو خالی ہاتھ ہال سے نکلنا پڑا اور کسی نے انہیں چندہ نہ دیا۔

جرمنی روانگی

اقبال انگلستان سے جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ روانہ ہوئے۔ ہائیڈل برگ میں وہ جرمن زبان سیکھنا چاہتے تھے۔ اقبال کی زندگی کے بہترین لمحے اس شہر میں گزرے۔ یہاں انہیں ایک جرمن خاتون فراؤلین ویگے ناست نے جرمن زبان کی تعلیم دی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اقبال، ان کی دوست عطیہ فیضی اور دیگر طلبا نے پکنک کا پروگرام بنایا۔ سب لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے مگر اقبال غائب تھے۔ اتنے میں ایک خادمہ چلاتی ہوئی آئی اور کہا نہ جانے اقبال کو کیا ہو گیا ہے۔ سب ان کے کمرے کی طرف دوڑے کمرے میں بتی جل رہی تھی، اقبال کے سامنے دو چار کتابیں میز پر کھلی پڑی تھیں اور اقبال سکتہ کے عالم میں خلا میں گھور رہے تھے۔ عطیہ فیضی نے نام لے کر پکارا لیکن اقبال نے کوئی جواب نہیں دیا، جس پر انہوں نے پریشان ہو کر جھنجھوڑا۔ اقبال چونکے اور کہا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا ذہن میرے جسم سے الگ ہو گیا ہے۔ اس کیفیت سے میں سخت پریشان تھا کہ آپ نے مجھے جگا دیا۔

اقبال لندن واپس پہنچے اور بیرسٹری کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ لندن ہی میں انہوں نے اسلامی موضوعات پر لیکچر دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا اور یوں ایک اسکالر کی حیثیت سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ وطن واپس پہنچ کر دیکھتے ہی دیکھتے اقبال کا شمار ہندوستان کے نہ صرف ایک بڑے شاعر بلکہ اہم مدبروں میں ہونے لگا۔

اقبال کی زندگی

اقبال یورپ کی چمک دمک دیکھ کر آئے تھے لیکن انہوں نے ساری زندگی درویشانہ اور فقیرانہ

گزاری۔ ان کی خوراک نہایت سادہ تھی۔ نوجوانی کے زمانہ میں بھی انہیں چٹور پن سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ عام طور پر گھر میں تہمد اور بنیان پہنے رہتے تھے۔ سردیوں میں ان پر ایک قمیض کا اضافہ ہو جاتا۔ عدالتوں میں جاتے وقت سوٹ پہن لیتے تھے لیکن جتنی دیر سوٹ پہنے رہتے، گھبرائے ہوئے سے نظر آتے۔ دورانِ وکالت معمول تھا کہ عدالت سے گھر واپس آ کے اپنا گھریلو لباس پہنتے اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتے۔ ساتھ ہی حقہ لگا ہوتا تھا۔ حقہ پیتے، کتابیں پڑھتے، مقدمات تیار کرتے، ملنے والوں سے باتیں کرتے۔ دن کے اوقات میں ایک وقت کا کھانا کھاتے، باقی اوقات میں چائے پیتے۔ مطالعہ کرتے تو اس میں غرق ہو جاتے۔ ایک مرتبہ وہ مطالعہ کر رہے تھے کہ بڑا زبردست زلزلہ آ گیا۔ مکان کی کھڑکیاں اور دروازے بجنے لگے۔ ملازم علی بخش بوکھلایا بوکھلایا کبھی ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور کبھی اوپر نیچے بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ اقبال بدستور مطالعے میں محو رہے، صرف ایک مرتبہ سر اٹھا کر علی بخش کو دیکھا اور کہا، "علی بخش اس طرح بوکھلائے بوکھلائے نہ پھرو، سیڑھی کے پاس کھڑے جاؤ۔" اور یہ کہہ کر دوبارہ کتاب میں ڈوب گئے۔ اقبال امیروں کی آؤ بھگت نہیں کرتے تھے اور بعض اوقات ان کی فرمائش پر اپنا کلام بھی نہ سناتے تھے۔ ان سے مسلمانوں کے علاوہ سکھ، ہندو اور عیسائی بھی محبت کرتے تھے کیونکہ ان کا دل آئینے کی طرح صاف تھا۔ بلاشبہ اقبال کی شخصیت عظیم تھی۔

*****

(اس مضمون کے لئے معلومات درج ذیل کتابوں سے لی گئیں)

۱۔ ذکرِ اقبال ..... عبدالمجید سالک
۲۔ سرگزشت ..... ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
۳۔ زندہ رود حصہ اول ..... ڈاکٹر جاوید اقبال

کیمرے کا تحفہ کسے ملا

ادارہ آنکھ مچولی نے ستمبر ۱۹۹۲ کی اشاعت میں کوپن بھیجنے والے ایک خوش قسمت ساتھی کو قیمتی کیمرہ تحفے میں دینے کا اعلان کیا تھا۔ اس سلسلے میں ہمیں ہزاروں کوپن موصول ہوئے لیکن قرعہ اندازی سے جس خوش نصیب ساتھی کا نام نکلا۔

وہ ہیں جناب عبدالسلام آفریدی

معرفت عبدالصمد خان۔ آفریدی شاپنگ سینٹر، عمر کوٹ، سندھ۔ ہم اپنے ساتھی کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ان کا تحفہ بذریعہ رجسٹرڈ پارسل روانہ کر دیا گیا ہے۔

جہنم میں چھلانگ

ڈیوڈ ٹن ایک بہادر اور بے باک آدمی ہے، اس نے اپنے کمالات دکھانے کیلئے آگ کے سمندر میں چھلانگ لگائی اور زندہ نکل آیا۔ اِن تصویروں میں آپ ڈیوڈ ٹن کی بہادری کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔

1

2

3

4

5

اندھیرے میں تیز روشنی دیتے ہوئے برٹل اسٹار کے بازو نظر آ رہے ہیں۔

برٹل اسٹار کا بازو تھوڑا سا ٹوٹ گیا تو کوئی بات نہیں، چند دن میں بازو بڑھ کر پہلے جتنا ہو جائے گا۔

ایک برٹل اسٹار اپنے لمبے بازو سمندری چٹان پر پھیلائے غذا تلاش کر رہا ہے

برٹل اسٹار اپنے لمبے بازوؤں کی مدد سے غذا تلاش کر رہا ہے

بریٹل اسٹار

کلیم چغتائی

آپ نے وہ نظم تو ضرور پڑھی ہوگی،

"ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار"

آج ہم آپ کو لٹل اسٹار تو نہیں البتہ "بریٹل اسٹار" سے ملواتے ہیں۔ آپ چونک تو گئے ہوں گے کہ یہ حضرت ہیں کون؟ بھئی یہ ہیں بریٹل اسٹار، پانی میں رہتے ہیں اور پانی بھی کونسا؟ سمندر کا..... اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اسٹار تو آسمان پر چمکتے ہیں، ہم شاید پانی میں ان کے عکس کی بات کر رہے ہیں۔ نہیں بھئی عکس نہیں، جیتا جاگتا اسٹار۔ جس کا قسمت سے کوئی تعلق نہیں!

آپ نے تارا مچھلی یعنی اسٹار فش کا نام تو سنا ہوگا۔ ممکن ہے آپ نے کسی ماہی گھر (ایکوریم) میں اسٹار فش دیکھی بھی ہو اور کچھ نہیں تو تصویر تو دیکھی ہوگی۔ بس یہ بریٹل اسٹار صاحب بھی اسٹار فش کے خاندان سے ہیں یعنی "اکائی نو ڈرمیٹا"۔ بریٹل اسٹار میں بعض انوکھی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کے بارے میں جان کر آپ یقیناً حیران ہوں گے۔

بریٹل اسٹار جسمانی لحاظ سے کسی تارے کی مانند ہوتے ہیں یعنی بیچ میں کسی تھالی کی مانند گول حصہ اور پانچ سمتوں میں پانچ لمبے لمبے بازو نکلے ہوتے ہیں۔ بریٹل اسٹار کی تقریباً اٹھارہ سو قسمیں ہیں، یہ دنیا کے تقریباً تمام سمندروں میں پائے جاتے ہیں، ان کی بعض قسموں کے بازو تو دو فٹ طویل ہوتے ہیں اور بعض قسموں کے برٹیل اسٹار مختصر سے ہوتے ہیں اور صرف چند انچ طویل بازوؤں سے کام چلاتے ہیں۔ یہ بازو بھی خوب ہوتے ہیں۔ ان پر سینکڑوں چھوٹے چھوٹے کانٹے سے نکلے ہوتے ہیں جو لیس دار ہوتے ہیں۔ پانی میں بہنے والے غذائی اجزا ان سے چپک جاتے ہیں۔ اسٹار صاحب اپنے بازوؤں کو اپنے جسم کے مرکزی حصے میں واقع اپنے منہ تک لے جا کر ان اشیا کو چٹ کر جاتے ہیں۔

بریٹل اسٹار کے بازو ان کے بڑے کام آتے ہیں۔ یہ بازو بڑے باوفا ہوتے ہیں اور اپنے مالک پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہ بازو اپنے آپ کو قربان کر کے بریٹل اسٹار کی جان بچانے کا سبب بنتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ بریٹل اسٹار کے کئی دشمن پائے جاتے ہیں

خیرات

○ ..... ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے۔ موضوع تھا خیرات۔ انہوں نے حدیث و قرآن کی روشنی میں خیرات اور اس کی برکتوں کا ذکر کیا۔ وعظ سننے والوں میں ایک کنجوس اور لالچی امیر بھی تھا۔ جونہی وعظ ختم ہوا وہ امیر آدمی اونچی آواز میں بولا..... "سبحان اللہ! خیرات کی برکات کا کیا کہنا۔ جی چاہتا ہے اسی وقت جھولی پھیلا کر گلی گلی خیرات مانگنے لگوں۔"

(نارتھ ناظم آباد کراچی سے فواد کریم کا چٹکلا)

○ ..... ○ ○ ..... ○

بدنام

○ ..... ایران کے ایک شاعر شہاب ترشیزی نے بھرے دربار میں ایک صاحب کو خر (گدھا) کہہ دیا۔ ان صاحب نے اس پر احتجاج کیا۔ بادشاہ نے شاعر سے کہا کہ شعر میں معافی مانگو۔ شاعر نے یہ شعر پڑھا۔

ترا خر گفتم و گشتم پشیمان
کہ آں بے چارہ را بدنام کر دم

ترجمہ..... "(میں تجھے گدھا کہہ کر بہت شرمندہ ہوں کہ اس بے چارے (گدھے) کو خواہ مخواہ بدنام کر دیا)۔"

(مرسلہ..... مختار احمد۔ پشاور)

مثلاً مچھلیاں، کیکڑے، جھینگے وغیرہ۔ جوں ہی کوئی دشمن، بریٹل اسٹار پر حملہ کرتا ہے اور ان کا بازو تھامنے کی کوشش کرتا ہے، بریٹل اسٹار کا یہ بازو ٹوٹ کر کے دشمن کے منہ یا ہاتھوں میں جکڑا رہ جاتا ہے اور بقیہ بریٹل اسٹار کسی محفوظ مقام کی طرف چلا جاتا ہے۔ بریٹل اسٹار کے بازو اتنے نازک ہوتے ہیں اسی لئے اسے "بریٹل اسٹار" کا نام دیا گیا ہے۔ بریٹل انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں، نازک، جلد ٹوٹنے والا۔

بریٹل اسٹار کو بازو گنوانے کا زیادہ غم نہیں ہوتا کیونکہ چند ہفتوں میں ٹوٹے ہوئے بازو کی جگہ نیا بازو اگ آتا ہے، اس طرح اگر ایک ایک کر کے تمام بازو ٹوٹ جائیں تو ان کی جگہ نئے بازو نکل آتے ہیں حتیٰ کہ اسٹار کے مرکزی حصے کو بھی اگر نقصان پہنچ جائے تو اسٹار کی چند قسمیں اس کی بھی مرمت کر لیتی ہیں۔ بازو گئے تو گئے، جان تو بچی!

بریٹل اسٹار کے بازو ان کے لئے ایک اور اہم خدمت انجام دیتے ہیں جوں ہی بازو، اسٹار سے الگ ہوتا ہے یہ تیز سبز رنگ کی روشنی خارج کرنے لگتا ہے۔ یہ روشنی بازو کی لمبائی میں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تیزی سے سفر کرتی ہے، باقی بریٹل اسٹار تاریک اور غیر روشن رہتا ہے چناں چہ حملہ آور، جو روشنی کی طرف متوجہ ہوچکا ہوتا ہے، بریٹل اسٹار کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بریٹل اسٹار صاحب کسی محفوظ پناہ گاہ کی راہ لیتے ہیں۔

اگر ایک جگہ بہت سے بریٹل اسٹار پڑے ہوں اور وہ اس طرح کی روشنی خارج کرنے لگیں تو یوں لگتا ہے جیسے ستارے دمک رہے ہیں۔ اس قسم کی روشنی کے جھماکے ایک منٹ میں پچاس تک ہوسکے

ہیں۔ اسٹار ذرا سا چھوئے جانے سے روشنی دینے لگتے ہیں۔ اتنی تیز کہ اسے پچیس فٹ دور سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک سائنسدان نے سمندر میں خاص طور پر کئی گھنٹے تک تیراکی کر کے دیکھا کہ جوں ہی اسٹار روشنی کے جھماکے پیدا کرتا ہے، کوئی نہ کوئی حملہ آور اس کے پاس سے گھبرا کر ہٹ جاتا ہے خیال ہے کہ روشنی کی وجہ سے حملہ آور ٹھٹھک جاتا ہے، گھبرا جاتا ہے اور عارضی طور پر اندھا ہوجاتا ہے۔ اس سائنسدان نے بتایا کہ ایک جائزے کے مطابق جو بریٹل اسٹار روشنی پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سے صرف ۷ فیصد کے بازوؤں کو حملہ آوروں نے نقصان پہنچایا تھا، جب کہ اس قسم کے جو جانور روشنی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان میں ۳۵ سے لے کر ۷۵ فیصد تک کو حملہ آور نقصان پہنچا چکے تھے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ ایک اسٹار ایک رات میں حملوں سے بچنے کے لئے صرف سات منٹ صرف کرتا ہے ورنہ تو حملہ آوروں کو خوفزدہ کر کے بھگانے کے لئے اسٹار کی تیز روشنی ہی کافی ہے۔

ایک اور مزے کی بات سنئے بریٹل اسٹار کا ذائقہ کیکڑوں کو پسند نہیں آتا لیکن اس بات کا خطرہ تو لگا رہتا ہے نا کہ کوئی شریر کیکڑا کب حملہ کر کے اسٹار کا بازو چکھ لے۔ اسی لئے جب بھی کیکڑا یا کوئی اور حملہ آور بریٹل اسٹار پر چڑھائی کرتا ہے، روشنی کے جھماکے اس کو یہ پیغام دینے لگتے ہیں کہ آپ نے عشائیہ کے لئے جس شے کا انتخاب کیا ہے وہ قطعاً لذیذ نہیں ہے۔

بریٹل اسٹار اپنی روشنی پیدا کرنے کی خصوصیت کی وجہ سے بہت سے چھوٹے جانوروں کے لئے بھی چوکیدار یا محافظ کا کام دیتا ہے۔ کیکڑے کی ایک قسم ہرمٹ کریب یا چھوٹے جھینگے، بریٹل اسٹار کی حفاظت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ وہ بریٹل اسٹار کے زیر سایہ رہتے ہیں اور بہت آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہیں تاکہ کہیں غلطی سے بریٹل اسٹار صاحب کے جسم کو نہ چھولیں اور وہ ناراض ہو کر چمکنے نہ لگیں۔ جب بھی کوئی حملہ آور بریٹل اسٹار پر حملہ کرتا ہے، اسٹار روشنی خارج کرنے لگتا ہے اور حملہ آور فرار ہونے میں بہتری سمجھ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اس طرح اسٹار کے ساتھ ساتھ اس کے زیر سایہ موجود چھوٹے حیوانات ہرمٹ کریب، جھینگے وغیرہ کی جان بھی بچ جاتی ہے۔

بریٹل اسٹار کسی بھی ملک کی معیشت کو مستحکم بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ مچھلیوں کی خوراک بن کر مچھلیاں فراہم کرتے ہیں دوسری جانب وہ سمندر میں حیوانات کے مرنے اور گلنے سڑنے، نیز بیکار اشیا کے سڑنے سے پیدا ہونے والے کچرے کو کھا پی کر سمندر کو صاف ستھرا بنائے رکھتے ہیں۔ گویا بریٹل اسٹار قدرت کے محکمۂ صفائی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ○○

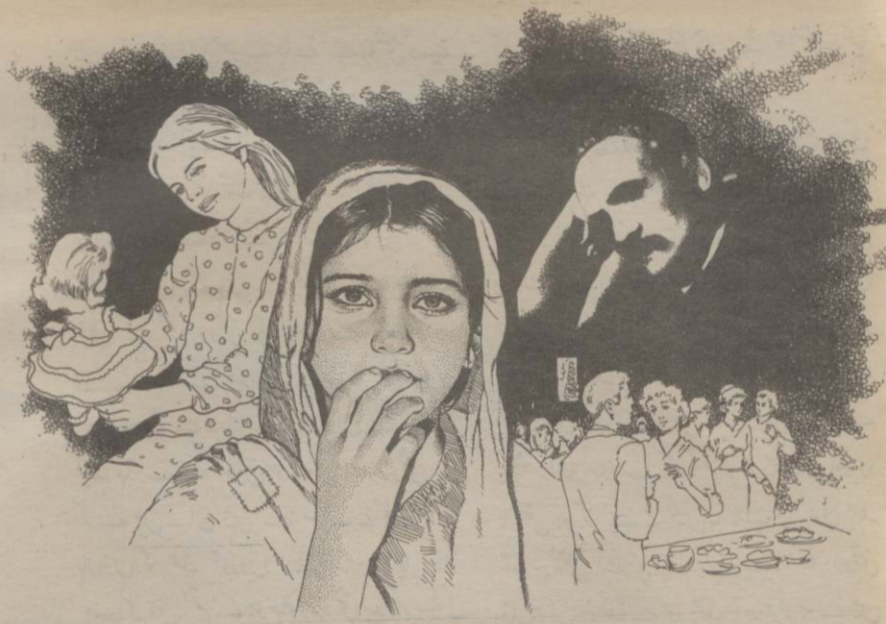

بڑی لڑکی

شازیہ فرحین

نجمہ نے ترچھی نظروں سے میرے نئے کپڑوں کو دیکھا اور چپ چاپ صفائی میں مصروف ہو گئی

"تھینک یو ویری مچ ممی!" میں نے بھی ستائشی نظریں ان ڈیسنٹ سے کپڑوں پر ڈالی اور ممی کے کاندھے پر سر ٹکا دیا۔

ممی نے میری قابل فخر کامیابی پر مجھے یہ سوٹ بطور انعام دیا تھا۔ دراصل کل میں نے مقامی ہوٹل میں معزز شخصیت کے ہاتھوں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا خراج وصول کیا تھا اور اپنے ممی ڈیڈی کو فخر سے سرشار کر دیا تھا کہ ان کی بیٹی بھی فن تقریر میں نووارد سہی مگر ایک منفرد مقام ضرور رکھتی ہے۔

ممی نے اس خوشی میں میری سہیلیوں کے لئے ایک چھوٹی سی پارٹی کا انتظام بھی کر رکھا تھا اور یہ کپڑے اسی تقریب کے لئے ممی نے پسند کئے تھے۔

سبز رنگ کے خوبصورت سے کپڑے جس پر لگا سرخ ربن بہار دکھا رہا تھا، مجھے اس قدر بھائے کہ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

نجمہ جلدی سے صفائی کر کے کچن میں آجاؤ، ڈھیروں کام پڑے ہیں" ممی نے آلوؤں کے کٹلس کے لئے ٹکیاں بناتے ہوئے حکم صادر کیا اور وہ روبوٹ کی مانند اپنے ہاتھ چلانے لگی۔

"ممی کیا میری مدد کی ضرورت ہے؟" میں نے اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے رسان سے پوچھا۔

"نہیں میری جان بس تم ان کپڑوں پر استری کر کے تیار ہو جاؤ چار تو بج ہی چکے ہیں۔" ممی نے چاہت سے بھرپور انداز میں مجھ سے کہا تو میں ایک ادا سے مسکرا دی۔

کپڑوں پر استری کرتے ہوئے کئی خوبصورت یادیں لبوں کو ہلا گئیں اور چہرے پر بہت سے رنگ بکھر گئے۔

سبز رنگ کا خوبصورت سوٹ مجھ پر بہت جچ رہا تھا اور پھر بل کھاتی ہوئی ننھی سی پونی ٹیل نے مجھے اپنے مکمل تیار ہونے کا یقین دلایا تو میں لان میں آگئی اور انتظامات میں ممی کا ہاتھ بٹانے لگی۔

گرم گرم پیک کیا ہوا چاکلیٹ کیک، چٹ پٹ کرتے دہی بڑے اور ٹھنڈی میٹھی رس ملائی نے جیسے میرے جی کو مزید خوش کر دیا۔

"ممی چاکلیٹ کیک بہت ہی اچھا ہے۔" میں نے ممی کی محنت کو سراہا۔

"واقعی"!

"جی ہاں۔" میں نے کریم کو لبوں سے چاٹتے ہوئے یقین دلایا اور کرسیوں کو ترتیب سے رکھنے لگی۔

میری سہیلیوں نے آنا شروع کر دیا تھا پہلے صائمہ آئی پھر ضوفشاں، فریحہ، نازو، سیلی، سجیلا اور اب بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ہر کسی کے ہاتھ میں خوبصورت تحفے اور پھر خلوص سے بھرپور مسکراہٹ، جس کے پیچھے خوشبوؤں کی مہک ہی مہک تھی "ہیلو فاری" پھٹ پھٹ کرتی موٹر سائیکل پر انجم بھائی بھی مسکراتے ہوئے آئے اور ہمیشہ کی طرح بے تکان بولتے ہوئے کھانے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑے۔

ایسے میں نجمہ کی پھرتی کی ہر کسی نے تعریف کی مگر ایک بات جو مجھے سخت کھٹکی کہ اس نے بھی آج سبز رنگ کے کپڑے زیب تن کئے تھے بالکل میرے جیسے۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ پرانے تھے اور میرے نئے۔

یہ کپڑے شاید اسے کسی نے پرانے کر کے دیئے تھے لیکن اسے آج ہی یہ کپڑے پہننے کی ضرورت کیا تھی۔ میں نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے سوچا اور اس سے پہلے کہ اپنی کسی سہیلی کے مذاق کا نشانہ بنتی۔ فوراً کچن میں اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی کیوں کہ یہ میری ہتک ہی تو تھی کہ اپنی ملازمہ جیسے کپڑے پہن کر میں لوگوں کے درمیان موجود رہوں۔

کچن میں پہنچ کر میں نے غصہ بھری لال لال آنکھیں اس کی جانب مرکوز کر دیں وہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹانے لگی۔

"نجمہ کیا تمہیں آج کے دن یہی کپڑے پہننے تھے؟" میرے لہجے میں سوال ہی سوال تھے "بی بی جی، یہی سب سے اچھے اور صاف ستھرے تھے۔ لال بنگلے والی مالکن نے کل ہی مجھے دیئے تھے۔" اس نے ڈرے سہمے انداز میں مجھے دیکھا میرے تیور اب تک قابو میں نہ تھے۔

"غلطی ہوگئی چھوٹی بی بی، معاف کر دیں۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور ناک رگڑتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اب میں مطمئن تھی۔ اس طرح جیسے بہت بڑے بوجھ سے آزاد ہو گئی ہوں۔ اس تقریب کو دلچسپ بنانے کے لئے میں نے پارسل گیم کا انتظام بھی کیا ہوا تھا اور ہم سب اس وقت پارسل گیم کھیلنے میں مصروف تھے۔

میں نے کیسٹ پلیئر پر میوزک بجانا شروع کر دیا اور شومئی قسمت کہ سیلی کی باری پر میوزک رک چکی تھی۔

"لطیفہ سنائیے۔" سیلی نے پرچی کھولتے ہوئے سر تھلایا اور لطیفہ سنانے لگی۔

"پڑوسن کے لڑکے کا انتقال ہوا تو زبیدہ نے اپنی لڑکی کو تعزیت کے لئے اس کے پاس بھیج دیا۔ کچھ دنوں بعد زبیدہ کی پڑوسن سے ملاقات ہوئی تو وہ شکایت کرنے لگی کہ تمہاری بیٹی کو تو تعزیت تک کرنی نہیں آتی، اس پر زبیدہ نے حیرانگی کا اظہار کیا اور افسوس سے کہنے لگی "بہن معاف کرنا میری بیٹی ذرا بے وقوف سی ہے، اب تمہارے دوسرے بیٹے کا انتقال ہو گا تو میں خود آؤں گی"۔

سیلی کے لطیفے پر قہقہے ہی قہقہے بکھر گئے، انجم بھائی نے تو ہنستے ہنستے پیٹ پکڑ لیا اور پھر میں نے بلا توقف میوزک چلا دی۔

گیم جاری تھا کہ ممی نے مجھے نجمہ کو بلانے کے لئے بھیج دیا۔ میں کچن میں گئی مگر نجمہ وہاں نہ تھی اور ممی کو لازماً اس وقت ہاتھ بٹانے کے لئے اس کی ضرورت تھی، مجھے اس وقت اس کے غائب ہو جانے پر بہت غصہ آیا اور اسے بہت کچھ سنانے کے لئے میں سرونٹ کوارٹر لڑکی جانب دوڑنے لگی مگر لکڑی کے بوسیدہ سے دروازے پر پہنچ کر میرے قدم ٹھہر گئے کیوں کہ اندر سے دبی دبی سسکیوں کی سی آوازیں آرہی تھیں۔

"دیکھ لیا انجام!" نجمہ کی ماں بلند آواز میں دھاڑی۔

"غریب ہو کر شہزادیوں کے سے کپڑے پہنے گی، میں نے کتنا کہا تھا کہ آج کے دن مالکن کے دیئے ہوئے کپڑے نہ پہن، چھوٹی بی بی کے بھی ویسے ہی کپڑے ہیں، لعنت ہے تجھ پر۔ مقابلہ کرتی ہے ان سے، نجمہ ان میں اور ہم میں بہت فرق ہے....." اس کی ماں کی زبان چلتی گاڑی کی مانند رواں تھی۔

"مگر ماں میرا دل چاہ رہا تھا نا!" نجمہ نے آنسوؤں کے درمیان رک کر کہا۔ کچھ دیر تک یونہی خاموشی چھائی رہی اور پھر نجمہ نے سوچ

میں ڈوبے ہوئے انداز میں ماں کی طرف دیکھا۔

"ماں اب اگر چھوٹی بی بی نے ایک چوٹی ڈالی ہو تو کیا میں ایک چوٹی بھی نہیں ڈال سکتی؟" نجمہ نے ہچکیوں سے روتے ہوئے دھیرے سے کہا تو اس کی معصومیت پر بیساختہ ماں نے اسے گلے سے لگا لیا اور میں جو باہر کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی نجانے مجھے کیا ہونے لگا کہ میں بیساختہ دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔

مجھے دیکھ کر نجمہ نے ڈرے سہمے انداز میں حیرانگی کا اظہار کیا اور دھیرے سے بولی "چھوٹی بی بی میں کپڑے تبدیل کر کے ابھی آئی" میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور آنسوؤں کا گیلا پن اب تک رخساروں پر عیاں تھا اور پھر وہ چپ چاپ میرے ساتھ چلی آئی۔ وہ پھرتی سے چل رہی تھی اور میرے قدم جکڑ گئے تھے، بھاری بھاری بوجھل سے۔

پارسل گیم اب تک جاری تھا مگر میرا دل اب بہت اداس ہو گیا تھا اور میں چور نظروں سے بار بار نجمہ کو ہی دیکھ رہی تھی جو ہر دو منٹ بعد اپنے دوپٹے سے آنکھیں رگڑنے میں مصروف تھی، ایسے، جیسے بہت جبر سے یہاں کھڑی ہو۔

میوزک اس دفعہ میری باری پر رکی کیوں کہ اب کیسٹ پلیئر کھولنے کی ذمہ داری انجم بھائی نے اپنے ذمہ لے لی تھی۔

علامہ اقبال کا کوئی خوبصورت سا شعر ترنم سے پڑھئے، میں نے پرچی کھول کر پڑھی، مگر ذہن اس وقت اتنا الجھا ہوا تھا کہ کوئی شعر بھی یاد نہ آیا اس سے پہلے کہ میری ہتک ہوتی نجمہ نے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ اسے شاید کوئی شعر یاد تھا، میں نے گردن کو خفیف سا خم دے کر اسے اجازت دی۔

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اسی راہ پر چلانا مجھ کو

نجمہ ترنم سے یہ اشعار پڑھتی جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی میری سہیلیاں حیران تھیں کہ ماجرا کیا ہے؟ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے سوال کرتیں بے اختیار کئی آنسو میری آنکھوں سے بھی پھسلے اور میں نجمہ کے پیچھے کچن میں چلی آئی۔

"نجمہ ادھر دیکھ" میں نے رسان سے کہا تو وہ حیرانگی سے مجھے گھورنے لگی۔

"نجمہ میں بہت بڑی لڑکی ہوں.....!" نجانے میرے اندر کیسی توڑ پھوڑ تھی کہ بیساختہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نرم ملائم مخملی ہاتھ، اور اپنے ہاتھوں میں میرا ہاتھ دیکھ کر پہلے تو وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کرنے لگی اور پھر لمحوں کے توقف کے بعد وہ دھیرے سے مسکرا دی اور اس کی یہ مسکراہٹ بڑی دلکش تھی۔

اسد کے پھول

کلیم چغتائی

دروازے کی گھنٹی بجی۔

"بیٹے دیکھنا تو کون آیا ہے۔" سلائی میں مصروف امی نے اسد سے کہا۔

"امی آپ ہی کھول دیجئے نا۔" اسد نے صوفے پر اوندھے منہ لیٹے لیٹے کہا۔ اس نے تکیہ اپنے منہ پر ڈال رکھا تھا۔ دروازے کی گھنٹی پھر بجی۔ امی نے گردن موڑ کر اسد کی طرف دیکھا۔

"اسد!" ۔ انہوں نے پھر آواز دی اور جواب نہ پاکر بڑبڑاتی ہوئی خود ہی اٹھیں۔ "توبہ ہے، اس قدر کاہل بچہ ہے یہ۔"

انہوں نے جاکر دروازہ کھولا۔ اسد کے ابو لپٹا بریف کیس اٹھائے اندر آگئے۔ "السلام علیکم" ۔ انہوں نے مسکرا کر کہا اور صوفے پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگے۔ "بھئی چپلیں کہاں ہیں؟" انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"بیٹا اسد ابو کی چپلیں لادو۔" امی نے پکار کر کہا اور خود اسد کے ابو کے لئے چائے بنانے چلی گئیں۔ اسد کے ابو نے ایک آدھ منٹ انتظار کیا پھر دوسرے کمرے میں چلے آئے جہاں اسد منہ لپیٹے صوفے پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔

"بیٹا کیا ہوا؟ بخار ہے؟"

"نہیں ابو۔" تکیہ میں سے آواز

آئی۔

"پھر یہ کیا طریقہ ہے؟"

"جی ان کا یہی طریقہ ہے۔" باہر سے امی کی آواز آئی، جو کھڑکی کی دوسری جانب باورچی خانے میں چائے بنانے میں مصروف تھیں۔

"اس کو سمجھایئے۔ کس قدر کاہل بچہ ہے۔ کوئی کام وقت پر نہیں کرتا۔ اسکول کا کام ملتا ہے تو بڑی سستی سے کرتا ہے۔ اوّل تو کھانے پینے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں اور اگر کھاتا ہے تو کاہلی کے ساتھ۔ گھر کا کوئی کام کہو تو منہ لٹک جاتا ہے۔ کھیل سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ صحت دیکھئے اس کی، ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو رہا ہے، آخر اس کا بنے گا کیا؟"

اسد کے ابو کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے پھر جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے وہاں سے انہوں نے اسد کو آواز دی۔ اسد ابو کی آوازیں سننے کے بعد بڑی مشکل سے اٹھ کر مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم کے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ "جی ابو!"

"بیٹا یہاں آؤ۔" ابو نے پیار سے بلایا۔ "آپ کو معلوم ہے، آپ کے نام کا کیا مطلب ہے؟" اسد نے جواب میں سر کو دائیں بائیں ہلایا جس کا مطلب تھا، "نہیں۔"

"اسد کا مطلب ہے شیر، آپ نے شیر تو دیکھا ہو گا؟"

"جی ابو۔"

"تو شیر تو جانوروں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ کیا ہے کہ اگر وہ سارا دن پڑا سوتا رہے تو اسے کھانے کو کون دے گا؟ شیر تو کبھی کاہل اور سست نہیں ہو سکتا۔ وہ تو بڑا چست اور تیز ہوتا ہے۔ آپ کیسے اسد ہیں، کاہل قسم کے شیر!"

اس نے کوئی جواب نہ دیا، بس خاموشی سے کھڑا دروازے سے لٹکے پردے کے کنارے کو مروڑتا رہا۔

..... ○○ ..... ○○ .....

جمعہ کے دن ناشتے سے فارغ ہو کر ابو نے اسد کو آواز دی۔ چلئے بیٹا گملے اور مٹی لے آتے ہیں۔ اسد حسبِ معمول صوفے پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ اس نے وہیں سے کہا۔ "ابو آپ ہی لے آئیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے، میں خود لے آؤں گا۔" ابو بازار گئے اور نرسری سے گملے اور مٹی لے آئے۔ ابو نے شام کو ان گملوں میں مٹی بھری ان میں بیج ڈال دیئے۔ اس وقت اسد بھی آکر بیٹھ گیا لیکن اس نے اپنے ابو کی کوئی مدد نہ کی۔

چند دنوں بعد گملوں میں ننھے ننھے پودے اُبھر آئے۔ ابو نے ان ننھے منے پودوں کو چڑیوں سے بچانے کے لئے ان پر جالی لگا دی۔ روزانہ وہ ان پودوں کو پانی دیتے تھے۔ یونہی کئی ماہ گزر گئے۔ پودے خاصے بڑے ہو گئے۔ ان میں پھول بھی کھلنے لگے۔ پھر دفتر میں کام زیادہ ہونے کی وجہ

سے ابو رات دیر سے گھر آنے لگے۔ امی کو کچھ لوگوں کو کپڑے سی کر دینے تھے، وہ اس کام میں مصروف تھیں۔ کئی دنوں تک پودوں کو پانی نہ ملا۔ پودے سوکھنے لگے۔

ایک صبح اسد یوں ہی گملوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے پودے اس سے ناراض ہیں۔ اس نے گلاب کے پودے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کی انگلی میں ایک کانٹا چبھ گیا۔ "سی" کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے گلاب کا مرجھایا ہوا پھول اس سے کہہ رہا ہو۔

"تم ہمارے دوست نہیں ہو۔ تم ہمارا خیال نہیں رکھتے۔ تم نے ہمیں کبھی پانی دیا؟ کبھی ہمارے گملوں میں کھاد ڈالی؟ کبھی گملوں سے کوڑا کرکٹ الگ کیا؟ تم یہاں کیوں آتے ہو؟"

اسد نے گھبرا کر دوسرے گملے پر نظر ڈالی تو اسے ایسا لگا کہ موگرے کا پودا بھی اس سے خفا ہے۔ اس کی سوکھی ہوئی ٹہنیاں اور زرد پتے اسے غصہ سے دیکھ رہے ہیں۔ پتوں نے اسے جھڑک کر کہا۔

"تم نے دیکھا، ہمارے تنے میں کیڑا لگ رہا ہے۔ تم نے ہمیں کیڑوں سے نہیں بچایا۔ ہم تمہیں اتنے پیارے پھول دیتے تھے۔ تمہاری امی اپنے بالوں میں انہیں لگا لیتی تھیں۔ ہم تمہیں خوشبو دیتے تھے۔ مگر تم نے ہمیں کیا دیا؟ تم تو ایک کاہل لڑکے ہو۔ تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے ہماری صحت کا کیا خیال رکھو گے؟

ہوا چلی تو سارے پودوں کے پتے پھڑپھڑانے لگے۔ اس کو ایسا لگا جیسے سارے پودے مل کر اس سے کہہ رہے ہوں "کہ" چھی چھی، جاؤ جاؤ۔"

اسد تڑپ کر اٹھا۔ غسلخانے سے اس نے بالٹی نکالی۔ اسے دھو کر اس میں پانی بھرا۔ لیک مگ اور بھری ہوئی بالٹی لے کر وہ گملوں کے پاس آیا۔ اس نے احتیاط سے، سارے گملوں کی صفائی کی، پھر آہستہ آہستہ نرمی سے سب میں پانی ڈالا۔ پانی ڈالنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس نے دیکھا کہ پودے کے مرجھائے ہوئے پتے ذرا تازہ دم لگنے لگے ہیں۔

رات میں اسد نے اپنے ابو کو بتایا کہ موگرے کے پودے میں کیڑا لگ رہا ہے۔ ابو اگلے دن کیڑے مار دوا لے آئے۔ اسد نے وہ دوا موگرے کے پودے پر چھڑک دی۔ چند دنوں میں موگرے کا پودا بالکل تروتازہ ہو گیا۔ پودوں کو توجہ ملی تو وہ خوشی سے جھومنے لگے۔ گلاب، سورج مکھی، گیندا، موگرا، گلِ داؤدی، چنبیلی اور زینیا کے پھول کھلنے لگے۔ اسد کے صحن میں ایسا لگتا تھا کہ پھولوں کی نمائش ہو رہی ہے۔

اسد کی امی بار بار اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ اسد کی عادتیں بہت بدل گئی تھیں وہ کھانا بھی ٹھیک طرح کھانے لگا تھا اور گھر کے کاموں میں بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اگر دیکھ بھال

نہ کی جائے تو پودوں کی طرح انسان کی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے۔

ایک شام ابو گھر آئے تو انہوں نے اسد کو بتایا کہ ۲۰ نومبر کو پاکستان میں بچوں کا عالمی دن منایا جا رہا ہے۔ انہوں نے اخبار کھول کر اسد کے سامنے رکھ دیا جس میں بڑا سا اشتہار چھپا ہوا تھا۔ بچوں کے رسالوں کی انجمن نے اعلان کیا تھا کہ اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسیف یعنی "بچوں کی بہبود کا ادارہ" کے فیصلے کے مطابق ہر سال پاکستان میں ۲۰ نومبر کو بچوں کا عالمی دن منایا جائے گا۔اس سال کا موضوع ہے "صحت بخش ماحول، صحت مند بچے۔" بچوں کے رسالوں کی انجمن نے اس دن بچوں کے لئے پھولوں کی نمائش کا اہتمام کیا ہے۔ اس نمائش میں پھولوں والے پودوں کا مقابلہ بھی ہو گا۔ اسکولوں کے جو بچے اس مقابلے میں حصہ لینا چاہیں وہ مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ قائم کریں۔"

"ابو۔ میں بھی مقابلے میں حصہ لوں گا" اسد جوش سے بولا۔

"ضرور بیٹے۔ میں تو خود یہی چاہتا ہوں۔"

اگلے دن اس کے ابو انجمن کے دفتر سے فارم لے آئے۔ اسے پُر کر کے انہوں نے اسد سے دستخط کروائے۔ اسد کے اسکول سے مہر لگوائی اور انجمن کے دفتر میں جمع کروا دیا۔ نمائش سے ایک دن قبل تمام بچوں کو اپنے اپنے دو دو پودے جمع کروانے تھے۔ اسد نے اپنے گملوں کو نیا رنگ کیا۔ ان پر خوبصورتی سے اپنا نام، کلاس، اسکول کا نام اور گھر کا پتا لکھا پھر اسد ابو کے ساتھ جا کر انجمن کے دفتر میں گملے جمع کروا آیا۔

اگلے دن نمائش کا افتتاح تھا۔ افتتاح سے پہلے کچھ تقاریر ہوئیں پھر مہمان خصوصی کو دعوت دی گئی۔ اس نمائش کے مہمانِ خصوصی بچوں کے امراض کے بہت بڑے ڈاکٹر انور صدیقی تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا۔

"بچو اس سال بچوں کے عالمی دن کا موضوع ہے، "صحت بخش ماحول، صحت مند بچے۔" مجھے خوشی ہے کہ ماحول کو صحت مند بنانے کے لئے، بچوں کے رسالوں کی انجمن نے پہل کی اور پھولوں کی نمائش کا اہتمام کیا۔ آپ جتنے زیادہ درخت لگائیں گے، ماحول اتنا ہی صاف ستھرا ہوتا جائے گا۔ آپ کو علم ہے، گاڑیوں کا دھواں فضا کو کتنا آلودہ کر دیتا ہے۔ درخت فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ لے کر آپ کو آکسیجن دیتے ہیں۔ درخت ہمارے کتنے اچھے دوست ہیں اور دوستوں کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے، اور بچو آپ بھی میرے اچھے دوست ہیں، آپ کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ میں زیادہ تقریر کروں گا تو آپ کی چائے ٹھنڈی ہو جائے گی اور گلاب جامن سوکھ جائیں گے، اور آپ کو نتائج کا بھی انتظار ہو گا۔ تو لائیے بھئی رزلٹ کہاں ہے؟"

"ایک صاحب نے ایک پرچہ ڈاکٹر صاحب کو

تھما دیا۔

"ہاں بھئی تیسرا انعام رضوان احمد۔" کے کے پبلک اسکول۔" تالیاں بجنے لگیں۔ ایک صاحب نے رضوان کا گملا لا کر اسٹیج پر رکھ دیا۔ اسد کے برابر بیٹھے اسد کے ابو نے اسد کا ہاتھ دبایا "دوسرا انعام۔" ڈاکٹر صاحب کی آواز لاؤڈ اسپیکر میں گونجی۔ "اسد انصاری۔ مہران اسکول" تالیاں پھر بج اٹھیں۔ اسد کو یقین ہی نہ آیا کہ اسد کا نام لیا گیا ہے۔ اسے شامیانہ، اسٹیج، بچے، کرسیاں سب گھومتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب ابو نے اس کے جسم کے گرد باہیں ڈال کر اسے لپٹا لیا تھا۔

اس دوران میں مہمانِ خصوصی، اوّل نمبر پر آنے والے لڑکے کے نام کا بھی اعلان کر چکے تھے۔ اسد کو بعد میں پتا چلا کہ پہلا انعام ایک لڑکی یاسمین نے جیتا تھا۔

اسٹیج پر اوّل، دوم، سوم آنے والے گملے رکھ دیئے گئے تھے۔ اسد کا گلاب کا پودا دوسرے نمبر پر آیا تھا۔ اول نمبر یاسمین کا چنبیلی کا پودا تھا۔

اسد کے ابو نے بتایا، "چنبیلی کو "یاسمین" بھی کہتے ہیں۔ یہ ہمارا قومی پھول ہے۔" تیسرے نمبر پر رضوان کا گلِ داؤدی کا پودا تھا۔ اس کے بعد اول دوم سوم آنے والے بچوں کو سرٹیفکیٹ دیئے گئے، ان کی تصاویر کھینچی گئیں۔ پھر حاضرین کو چائے کی دعوت دی گئی۔

چائے کی میز پر کچھ بچے ندیدے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے جلدی جلدی کھانے میں مصروف تھے۔ ایک بچے کے ہاتھ سے پیسٹری زمین پر گر گئی، اس نے پیسٹری زمین سے اٹھالی اور بغیر مٹی صاف کئے، اسے کھانے کے لئے منہ کی طرف بڑھانے لگا۔ اسد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اوں ہوں۔ مٹی لگی ہوئی چیزیں نہیں کھاتے۔ تمہیں پتا نہیں؟ اس سال بچوں کے عالمی دن کا نعرہ کیا ہے؟

"صحت بخش ماحول، صحت مند بچے!"

●●

ایک تکلیف دہ غلطی

رسالے بھی انسان ہی نکالتے ہیں اس لئے کسی غلطی کا ہو جانا تعجب کی بات نہیں لیکن کبھی کبھی کوئی غلطی اتنی تکلیف دہ ہو جاتی ہے کہ اچھے بھلے رسالے کا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء کے شمارے میں غلطی سے شگفتہ شمیم کی کہانی "سنگدل" اور عبدالستار خان کا معلوماتی مضمون "سومنات کی دہلیز پر" آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ کہانی کے صفحات مضمون میں اور مضمون کے صفحات کہانی میں مل جانے سے دونوں تحریریں پڑھنے والوں کے لئے سخت کوفت کا باعث ہوئیں۔ خود مصنفین کو بھی اس سے سخت تکلیف ہوئی ہو گی۔ ادارہ آنکھ مچولی اپنے پڑھنے والوں اور مذکورہ لکھنے والوں سے تہہ دل سے معذرت خواہ ہے۔

گیتوں کی کہانی

جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو کی پولش طالبہ جوانا کولا چینسکا کی ایک خوبصورت کہانی

جب ساری دنیا بن گئی تو ہر ایک کو کہنا پڑا کہ واقعی یہ دنیا بہت خوبصورت ہے۔ اس دنیا میں سمندروں کے درمیان بڑے بڑے براعظم واقع ہیں اور ان پر پہاڑ اور جنگل اُگے ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف اور ان کے دامن میں نرم نرم گھاس بچھائی گئی ہے جس میں مختلف پھول بھی ملتے ہیں۔ جنگلوں میں مختلف جانور رہتے ہیں اور درختوں پر چڑیاں گھونسلے بناتی ہیں۔

عُقاب پرندوں کا بادشاہ ہے۔ ایک زمانہ میں جب لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ عُقاب بہت اونچا اُڑتا ہے، چاند، سورج اور ستاروں سے بھی زیادہ اوپر..... عُقاب خود بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ اسے اتنا اونچا اُڑنا کیسے آتا ہے؟ اس لئے کہ اس وقت دنیا بے آواز تھی اور عُقاب کی بھی آواز نہیں تھی اور نہ جانوروں، سمندروں، جنگلوں اور لوگوں کی آواز تھی۔ دنیا میں سب کچھ آج کی طرح

خوبصورت تھا لیکن خاموش، بے آواز اور اُداس اُداس سا۔

ایک دن عُقاب بہت اونچا اُڑا اتنا اونچا کہ آسمان تک پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ فرشتے ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں اور کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک فرشتہ سونے کا ایک صندوق لے کر آیا اور ہیرے کی چابی سے اس کو کھولنے لگا۔ کھول کر صندوق میں سے موتیوں کا ایک ہار نکالا۔ پھر اس نے ہار کی ریشمی ڈوری کھولی اور ہر فرشتے کو ایک ایک موتی دینے لگا۔ سکون سے یہ سارا کام ہوتا رہا۔ کسی نے جھگڑا، لڑائی یا شکایت نہیں کی۔ نہ کوئی چیخا "مجھے دو! مجھے!" عُقاب حیران حیران دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اس کو معلوم نہ تھا کہ اب کیا ہو گا۔ جب موتی تقسیم ہو گئے تو سارے فرشتے ایک لمبے تخت پر بیٹھ گئے۔ پھر ہر ایک نے اپنا اپنا موتی حلق میں رکھا اور گیت گانے شروع کئے۔

ہائے یہ آواز کتنی خوبصورت ہے! عُقاب نے پہلی مرتبہ آواز سنی تو خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جب وہ زمین پر واپس آیا تو بہت اُداس تھا۔ کوئی بھی چیز اس کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ نہ اونچے پہاڑ نہ ستارے نہ برف۔ وہ صرف اس صندوق کے بارے میں سوچتا رہا جس میں گیت کے موتی بند تھے۔ "میں وہ صندوق یا موتی چرا لوں گا۔" اس نے سوچا۔

چڑیوں نے دیکھا کہ ان کا بادشاہ عُقاب اُداس ہے۔ نہ وہ کھانا کھاتا ہے نہ سوتا ہے اور کہیں چھپ جاتا ہے۔ ہر روز چڑیاں اور اُداس ہو جاتیں۔ وہ اس کے بارے میں نہ بات کر سکتیں نہ گا سکتیں کیونکہ وہ بے آواز تھیں۔

آخر کار ایک دن عُقاب آسمان پر گیا اور وہاں چھپ گیا۔ جب فرشتے سو گئے تو اس نے بڑی مشکل سے پنجوں اور چونچ سے صندوق کو کھولا، یہاں تک کہ اس کی چونچ مُڑ گئی اور ٹیڑھی ہو گئی اور پنجوں سے خون نکلنے لگا۔ وہ موتیوں کا ہار لے کر زمین کی طرف اُڑ آیا لیکن معلوم نہیں شاید ہار ستارے سے اٹک گیا یا اس کی ڈوری کو سورج کی گرمی نے جلا دیا، بہرحال ریشم کی ڈوری ٹوٹ گئی اور سارے موتی بارش کی قطروں کی طرح گرنے لگے۔ ایک موتی سمندر میں گرا تو سمندر کی لہروں میں شور پیدا ہونے لگا۔ دوسرا موتی جنگل میں گرا تو جنگل نے گنگنانا شروع کر دیا۔ پھر چشمے بولنے لگے۔ پھر پہاڑوں نے گونجنا شروع کیا۔

چڑیاں سمجھیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی مکھیاں ہیں جو گر رہی ہیں اس لئے انہوں نے سب سے زیادہ موتی پکڑے چنانچہ وہ سب سے زیادہ گانا گاتی ہیں۔

گھر کے سامنے ایک لڑکا بیٹھا ہوا لکڑی میں پھونک رہا تھا جس میں سوراخ بنے ہوئے تھے۔ اچانک ایک موتی سوراخ میں گر گیا اور بانسری بجنے لگی۔ لڑکا بہت خوش ہوا اور اس نے کہا۔ "واہ

کتنی خوبصورت آواز ہے۔"

عُقاب نے سب سے بڑے موتی کو پکڑ لیا اور کہیں چھپا لیا لیکن اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے چوری کی ہے۔ چاند، ستارے، سورج چیخ چیخ کر کہتے رہتے "چور! چور!"

عقاب نے اپنا آخری موتی بُلبُل کو دے دیا اور بُلبُل نے وہ موتی ابابیل کو دیا پھر ابابیل نے اسے انسان تک پہنچا دیا۔ فرشتوں کے موتی زمین پر صرف تین دن رہے کیونکہ شام کی دُھند میں وہ پگھل گئے اور پھر ہوا بن کر اڑ گئے۔ مگر اس وقت تک انسان سارے موتیوں کی آوازوں کی نقل کرنا سیکھ گیا تھا۔ اس موتی کی جو سمندر میں گر گیا اور اس کی بھی جو پہاڑ پر گرا اور جنگل کے موتی کی بھی جس کی آواز سب سے زیادہ تھی۔ اس وقت سے عُقاب اتنا اونچا نہیں اڑتا، اس کی چونچ بھی اب تک ٹیڑھی ہے اور پنجے مڑے ہوئے ہیں۔ بُلبُل صرف اندھیرے میں گانا گا سکتا ہے۔ لوگ ابابیل کو گھر میں رہنے دیتے ہیں اور انسان وہ گیت جانتا ہے جس میں آوازیں شامل ہوتی ہیں اور اپنے ہر کام میں، غم میں، خوشی میں اس سے کام لیتا ہے۔ ہم کو اس گیت سے محبت اور اس کی عزّت کرنی چاہئے کیونکہ وہ فرشتوں کا گیت ہے اور عُقاب کی قربانی اور ننھے پرندے ابابیل کے پیار کے باعث ہم کو ملا ہے۔

(مرلزی خیال یانوش کور چاک کے انسان سے ماخوذ)

..... ○○ .....

نماز کی سائنسی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے نماز کی اہمیت قرآن پاک میں متعدد جگہ بیان فرمائی ہے ہمارے پیارے اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اسے جنت کی کنجی قرار دیا ہے۔ یاد رکھئے نماز صرف عبادت ہی نہیں ہماری ضرورت بھی ہے۔ ذرا غور کیجئے دن بھر میں پانچ مرتبہ ہاتھ منہ پاؤں صاف کرنا۔ دانت صاف کرنا۔ وقت کی پابندی کرنا ہماری صحت اور ہماری تندرستی میں کتنی اہمیت کے حامل ہیں۔ پھر نماز پڑھنے کی حالتیں یعنی قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ ہر ہر ادا، ہر ہر حالت بہت بڑی نیکی ہے۔ یہ ایسی عبادت ہے جس میں قلبی اور اعصابی نظام یکجا ہو کر ذہن کو سکون اور دل کو اطمینان بخشتے ہیں۔

سائنسی طور پر یہ بات طے ہو چکی ہے کہ نماز انسانی جذبوں کی تسکین کا سبب ہے۔ دوران خون کی باقاعدگی کا نظام ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب آپ سجدے کی حالت میں ہوتے ہیں تو دل اور دماغ کو تقویت ملتی ہے۔ نماز صرف روحانی علاج نہیں سائنسی تحقیق کے مطابق بدن کے لئے انتہائی مفید بھی ہے کیونکہ نماز اعصاب کو مقوی اور توانا رکھنے کے ساتھ عقیدے اور ارادے کو مضبوط کرتی ہے۔ نماز ذہن کی راہیں ہموار اور کشادہ کرتی ہے اور ہم بہتر انداز سے سوچ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں کیونکہ ہمیں آخرت کا حساب دینا ہے اور سب سے پہلا سوال نماز ہی کے بارے میں ہو گا۔

تو ساتھیو! کب سے آپ نماز پڑھنا شروع کر رہے ہیں؟

مرسلہ ..... فریحہ عابد فیصل آباد۔

اچھا کام بڑا نام

نوبل انعام کی کہانی

ش یم خلد

سا ری دنیا میں یہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو کسی شعبے میں بڑا کام کرتے ہیں، انہیں انعام ملتا ہے۔ پھر وہ اپنے کام سے اور اپنے انعام سے پہچانے جاتے ہیں۔ نوبل انعام دنیا کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اس کی کہانی کچھ یوں ہے۔

سویڈن میں ایک مشہور کیمیادان تھا، الفریڈ نوبل۔ جب وہ مرنے لگا تو اس نے وصیت کی کہ اس کی ساری دولت سے چھ شعبوں میں اہم خدمات انجام دینے والی شخصیات کو انعامات دیئے جائیں۔ چناچہ ۱۸۹۶ء میں الفریڈ نوبل کی وفات ہوئی تو ان کی جائیداد سے (جس کی مالیت اس وقت ۸۹ لاکھ ۶۰ ہزار ڈالر تھی) ایک فاؤنڈیشن قائم کی گئی۔ یہی فاؤنڈیشن ہر سال ۱۰ دسمبر کو نوبل انعام دینے کا اہتمام کرتی ہے۔ ۱۰ دسمبر کو الفریڈ نوبل کی برسی اور فاؤنڈیشن کے قیام کا دن بھی ہے۔ اس تاریخ کو الفریڈ نوبل کے وقف کردہ فنڈ سے چھ مخصوص شعبوں (کیمیا، طبیعیات، علم الابدان (فزیالوجی)، معاشیات، ادب اور امن) میں اہم خدمات انجام دینے والی شخصیتوں کو نوبل انعام دیا جاتا ہے۔ نوبل انعام سب سے پہلے ۱۹۰۱ء میں دیا گیا تھا۔

اب تک جو نوبل انعامات دیئے گئے ہیں ان میں سب سے بڑا انعام ۱۹۹۱ء میں دیا گیا۔ یہ رقم ۵ لاکھ ۷۰ ہزار پونڈ پر مشتمل تھی۔ سب سے کم مالیت کا نوبل انعام ۱۹۲۳ء میں دیا گیا تھا جس کی، مالیت ۶ ہزار ۶ سو ۲۰ پونڈ تھی۔ اب تک سب سے زیادہ نوبل انعام حاصل کرنے والا ملک امریکہ ہے جس نے ۲۰۶ نوبل انعامات حاصل کئے ہیں۔ ریڈ کراس واحد تنظیم ہے جس نے تین نوبل انعام حاصل کئے ہیں۔ ادب کے شعبے میں بہت سے عالمی سطح کے ادیب ایسے ہیں جو مستحق ہونے کے باوجود نوبل انعام سے محروم رہے۔ مثلاً روس کے عظیم **ناول** نگار لیوٹا لسٹائی یا علامہ اقبال۔ ہندوستان کی دو شخصیتوں نے نوبل انعام حاصل کیا۔ بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور اور مدر ٹریسا پاکستانی سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام کو بھی نوبل انعام مل چکا ہے۔ اور اصولاً عبدالستار ایدھی کو بھی یہ انعام ملنا چاہئے۔

نوبل پرائز

دنیا کا سب سے قیمتی انعام

ش۔م خالد

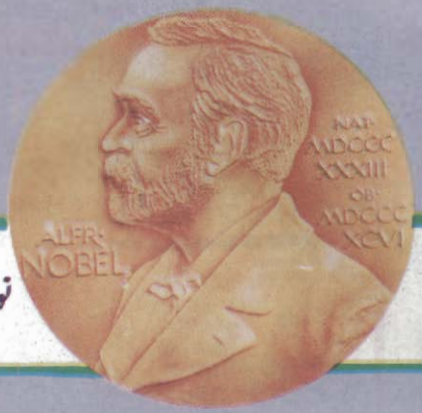

نوبل پرائز کے ساتھ دیئے جانے والا میڈل

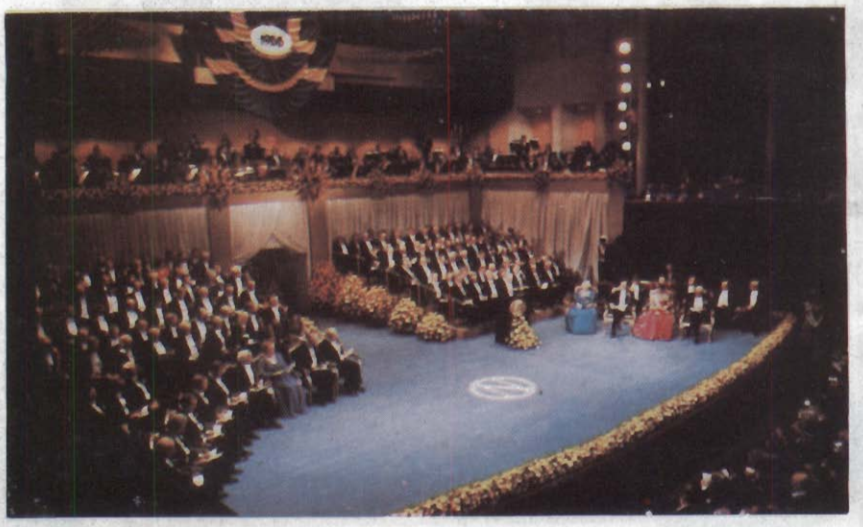

نوبل انعام کی تقسیم کے سلسلے میں منعقد ہونے والی ایک تقریب کا منظر

بچّوں کیلئے انمول تحفہ
ڈرامے، گیت، مزاحیہ خاکے خبریں، معلوماتی پروگرام اور بہت بہت کچھ
AANKH MACHOLI
VIDEO MAGAZINE
آنکھ مچولی
ویڈیو میگزین
فن کار : ظِل سبحان، نگہت بٹ، قاسم عیسیٰ، جمشید انصاری، لطیف منّا، نجیب اللہ انجم، شاہد اسماعیل اور بہت سے دوسرے۔
موسیقی : ارشد محمود ، پروڈیوسر : ظفر محمود شیخ ، ہدایات : سلیم مغل، اظہر نیاز !
آج ہی طلب فرمایئے
ویڈیو میگزین
آنکھ مچولی
Aankh Macholi Video Magazine
1 - PIB Colony Karachi
قیمت : 150 روپے

عالمی فٹبال ٹرافی

جو کئی بار چرائی جا چکی ہے

علی حیران

ورلڈ کپ فٹبال ٹرافی کی کہانی بہت حیرت انگیز اور دلچسپ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کو دو مرتبہ چرایا جا چکا ہے۔ اسے ایک مرتبہ جنگ کے دنوں میں چوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے جوتے کے ڈبے میں چھپا دیا گیا تھا تاکہ چور اُچکے کی اس پر نظر نہ پڑ سکے۔ ایف آئی ایف اے کی ورلڈ کپ ٹرافی کو کھیلوں کی دنیا میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ورلڈ کپ میں شرکت کرنیوالے ہر ملک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ورلڈ کپ ٹرافی کو انعام میں حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

کھیلوں کی دنیا میں یہ مہنگی ترین ٹرافی ہے۔ لالچی لوگوں اور چور اُچکّوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس ٹرافی کو روم (اٹلی) کے ایک بینک کے لاکر میں رکھ دیا گیا ہے۔ ورلڈ چمپئن شپ کے خیال کو ۱۹۲۸ء میں منظور کیا گیا۔ ایف آئی ایف اے نے فیصلہ کیا کہ ٹورنامنٹ جیتنے والی ٹیم کو ٹرافی پیش کی جائے گی۔ اس فیصلے کے تحت فرانسیسی مجسمہ ساز لافلپور کو مجسمہ تراشنے کی ہدایت کی گئی۔ لافلپور نے فاتح ٹیم کے لئے جیت کی دیوی بنانے کا فیصلہ کیا اس نے ۱۸ء۱ کلو گرام سونا (ایک اعشاریہ آٹھ کلو گرام) مجسمے کی دیوی کے بازوؤں پر لگایا۔ دیوی نے سر کے اوپر اپنے کھلے ہاتھوں میں ہشت پہلو برتن پکڑا ہوا تھا۔ لافلپور نے اسے ایک قیمتی پتھر کے اوپر رکھا۔ جیت کی دیوی کے ہاتھ میں ہشت پہلو برتن کی وجہ سے "ورلڈ کپ" کا لفظ معرض وجود میں آیا اور اس کے حاصل کرنے کی ایک نہ ختم ہونے والی دوڑ شروع ہو گئی۔

۱۹۳۰ء میں ہونے والا پہلا ورلڈ کپ ٹورنامنٹ "یوراگوائے" نے جیتا۔ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۸

میں اٹلی نے یہ ٹورنامنٹ جیتنے کا اعزاز حاصل کیا۔ جنگ عظیم دوئم کی وجہ سے ۱۹۵۰ء تک یہ ٹورنامنٹ نہ ہو سکا۔ جنگ کی وجہ سے قیمتی ٹرافی کو چرانے کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہا۔ اسی وجہ سے اس وقت کے ایف آئی ایف اے کے نائب صدر "اونوریتی باراسی" نے ورلڈ کپ کو نازیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے جوتے کے ڈبے میں رکھ کر اپنی خواب گاہ کے بستر کے نیچے چھپا دیا۔ ۱۹۴۶ء میں ایف آئی ایف اے کے صدر جیولزرمٹ کے اعزاز میں ورلڈ کپ کو جیولزرمٹ کا نام دے دیا گیا۔ اگلے بیس برس تک ٹرافی کے بارے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ لیکن ۱۹۶۶ء میں جب برطانیہ نے اس ٹرافی کو جیتنے کے بعد "ویسٹ منٹر ہال" میں نمائش کے لئے رکھا تو وہاں سے اس کو چرا لیا گیا۔ اس کی تلاش کے لئے پورے برطانیہ کی پولیس کو چوکنا کر دیا گیا۔ چوری کے ایک ہفتہ کے بعد ایک کارکن ڈیوڈ کارٹ "جنوبی لندن" میں واقع اپنے اپارٹمنٹ کے باہر اپنے کتے کے ہمراہ کسی کو فون کرنے کے لئے جا رہا تھا کہ اپارٹمنٹ کے جنگلے کے نیچے اس کے کتے پکلز کو اخبار میں لپٹی ہوئی ایک چیز ملی۔ کارٹ نے کہا "کتے نے میری توجہ اس چیز کی طرف مبذول کرائی یہ چیز اخبار میں بڑی مضبوط سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں صرف اتنا جان سکا کہ یہ قدیم مجسمہ قسم کی کوئی چیز ہے۔ میں نے اخبار کے کناروں کو کھینچا اور میں صرف اس مجسمہ کا معمولی سا حصہ دیکھ سکا۔ اس کے بعد میں نے کاغذ کو اور زیادہ پھاڑ دیا تو میں نے برازیل ٹرافی پر یورا گوائے اور جرمنی کے نام کندہ دیکھے میں فٹ بال کا بڑا مداح ہوں اور مجھے پہلے ہی علم تھا کہ کپ چرایا جا چکا ہے، میں خوشی سے اچھلا اور سیدھا پولیس اسٹیشن گیا۔"

کارٹ کو انعام کے طور پر ۱۴۲۰۰ امریکی ڈالر دیئے گئے اس واقعہ سے "کارٹ" اور اس کے دو سالہ کتے "پکلز" کو بڑی شہرت ملی۔ پکلز ۱۹۷۳ء میں مر تو گیا لیکن اس کا نام فٹبال کے مداح آج بھی جانتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں برازیل نے تیسری مرتبہ ورلڈ کپ جیتنے کا اعزاز حاصل کر لیا اس طرح یہ ورلڈ کپ برازیل کے مستقل قبضے میں چلا گیا۔ یعنی وہ اس کا تا حیات مالک بن گیا۔

تب ایک نئی ٹرافی بنائی گئی اس مرتبہ اٹلی کے مجسمہ ساز "سلیو گزانیگا" نے اس کا ڈیزائن بنایا گزانیگا کا ڈیزائن اونچائی میں ۳۶ سنٹی میٹر (۱۴ انچ) تھا۔ یہ ۱۸ قیراط خالص سونے کا بنایا گیا تھا اور اس کا وزن ۴ء۹۷ کلو گرام (۱۱ پونڈز) تھا۔ اس قیمتی ٹرافی کی ۲ لاکھ ۳۰ ہزار امریکن ڈالر میں انشورنش کرائی گئی ٹرافی کا ڈیزائن کچھ اس طرح کا تھا کہ ملتے جلتے "انسانی" کمر سے کمر ملا کر کھڑے ہیں اور ان کے پیچھے کندھوں پر گلوب کو رکھا گیا اس کے اوپر جیتنے والوں کے نام کندہ ہیں "رمٹ کپ" کے برعکس یہ ٹرافی ایف آئی ایف اے کی مستقل ملکیت ہے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۸۳ء میں اس قیمتی ٹرافی کو

بھی چرالیا گیا۔ ایک نقاب پوش برازیلین فٹبال کنفیڈریشن کے دفتر میں زبردستی گھس گیا اور اس نے چوکیدار کو باندھ کر ٹرافی کو چرالیا۔ فٹبال کے سپر اسٹار "پیلے" اور رائیو لانفرنے ٹی۔ وی پر ذاتی طور پر اپیل کی کہ جس کے پاس بھی ٹرافی ہے اس کو واپس کر دے۔ کنفیڈریشن نے واپس کرنے والے کے لئے انعامی رقم کا بھی اعلان کیا۔ پولیس نے ٹرافی کو تو تلاش کر لیا لیکن ٹرافی کے ارد گرد لگا ہوا سونا اتار لیا گیا تھا۔

مناسب دام۔ بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پائیے

86 روپے بچائیے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے۔

منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھئے:
دیگر ممالک کے لئے زرِ سالانہ کی شرح -/۳۰۰ روپے ہے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

ماہ نامہ آنکھ مچولی ۱-پی آئی بی کالونی۔ کراچی نمبر ۵۔ ۷۴۸۰۰

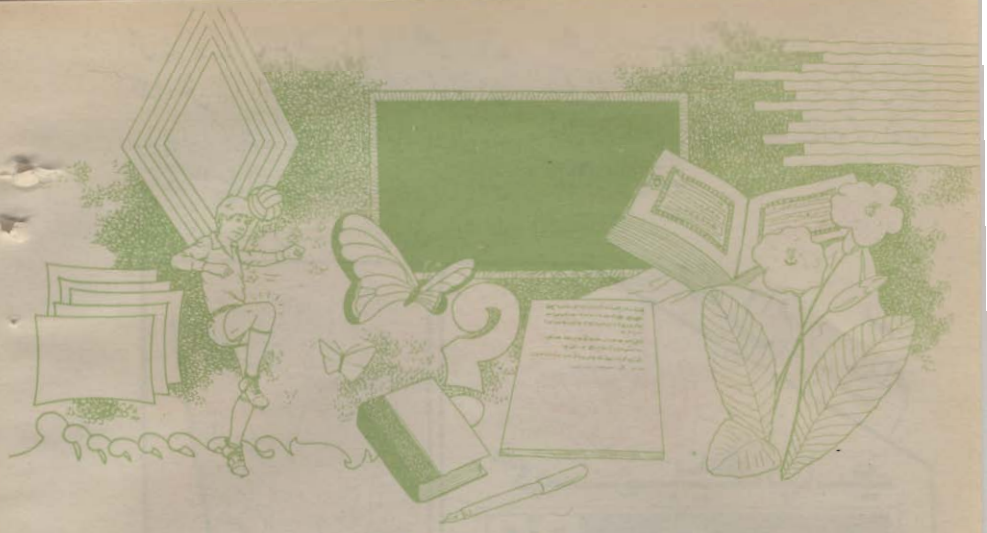

بوجھو تو جانیں

اس ماہ کی پہیلیاں ہمیں محمد علی صاحب نے ٹنڈو آدم سے ارسال کی ہیں۔

۱۔ ایک سمندر تیں جزیرے بکھرے ان میں موتی ہیرے
جو بھی ان کی سیر کو جائے مفت میں ہیرے موتی پائے

۲۔ دِلّی پہنچے، ڈھاکہ پہنچے، جا پہنچے قندھار لندن، پیرس، برلن پہنچے، جائے سمندر پار
دنیا بھر کا چکر کاٹے اور نہ دیر لگائے دیس دیس کی بولی بولے سب کا جی بہلائے

۳۔ سر پر نُور کے تاج سجائے دو راجے اک دیس سے آئے
ایک سے ہر کوئی آنکھ ملائے ایک سے ہر کوئی آنکھ چُرائے

۴۔ اس کے بازو ہیں نہ ٹانگیں پھر بھی مارے خوب چھلانگیں
اُچھلا، کُودا، دوڑ کے آیا سب نے مار کے پرے بھگایا

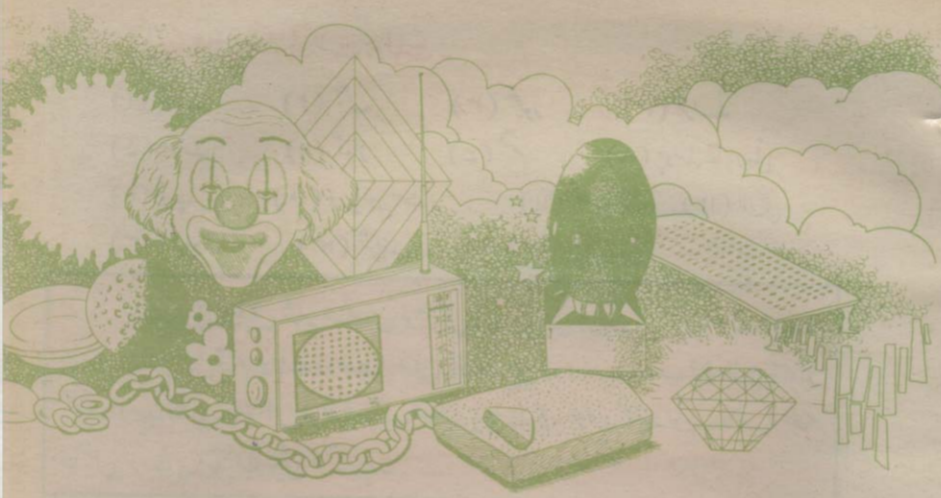

۵۔ منہ ان کا کرتے ہیں کالا سینے پر رکھتے ہیں بھالا
علم کے جتنے ہیں شیدائی سب نے ان پر آفت ڈھائی

۶۔ ایک نے جب دوجے کو پیٹا دوجے نے بھی اسے گھسیٹا
رہتی ہے دونوں میں کِل کِل دونوں کے پتھر کے ہیں دل

۷۔ کانپے اس سے ایک زمانہ کوئی بنے گر اس کا نشانہ
گرچہ چیز تو ہے چھوٹی سی کھا جائے وہ پوری بستی

۸۔ منہ بھی کالا پیٹ بھی کالا کالا اس کا رنگ
مٹّی کھائے گوری چٹّی خوب ہے اس کا ڈھنگ

۹۔ بیٹھا ہے وہ دانت نکالے ہر شے اپنے منہ میں ڈالے
کھا لے سب کچھ بنا چبائے ہر لیک اس کا اُگلا کھائے

گزشتہ ماہ کی پہیلیوں کے دُرست جوابات۔

(۱) خواب (۲) آگ (۳) کھجور (۴) خراٹے
(۵) ہونٹ (۶) آواز (۷) قسم (۸) چولہا، توا، روٹی
(۹) توپ (۱۰) دریا اور سمندر (۱۱) مچھر (۱۲) الائچی
(۱۳) کمپیوٹر (۱۴) شریفہ

گزشتہ ماہ کی پہیلیاں شاید ساتھیوں کو مشکل محسوس ہوئی ہیں کیونکہ ہمیں صرف ایک ہی خط ملا ہے جس میں تمام جوابات درست ارسال کئے گئے ہیں اور درست جواب دینے والی ہیں سکھر کی محترمہ ادیب فاطمہ۔ لہٰذا اس ماہ صرف ایک انعام دیا جائے گا۔ ادارہ محترمہ ادیب فاطمہ کو انعام حاصل کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

صرف ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام۔

سجاد احمد خان، حیدر آباد۔ سید محمد فرخ، تھلہ، سکھر۔ سید عرفان علی، حیدر آباد۔

ایک سے زیادہ غلط جواب دینے والوں کے نام:۔

محمد محسن مبین، نواب شاہ۔ سیدہ طیبہ معراج، کراچی۔ سید رابعہ نقوی، کراچی۔ سیدہ شبیہ فاطمہ، کراچی۔ مصطفےٰ کامران فاروقی، راولپنڈی۔ سیدہ عائشہ جبیں، کراچی۔ سید مصطفےٰ الرحمٰن، کراچی۔ سید عبداللہ واحد، کراچی۔ سید ضیاء الرحمٰن، کراچی۔ سید حبیب اللہ نور، کراچی۔ عدنان احمد صدیقی، کراچی۔ شہزاد اکبر، (؟) ۔ سید عبدالرحمٰن نقوی، کراچی۔ سیدہ صالحہ فاطمہ، کراچی۔ خوبصورت فائزہ، کراچی۔ سید شہزاد عالم، کراچی۔ ثمینہ شمس، کراچی۔ افشاں عبدالغفور مٹھانی، کراچی۔ جاوید صالح محمد مٹھانی، کراچی۔ امبر خان، کراچی۔ فہد عمران، کراچی۔ آفتاب احمد بھٹو، حیدر آباد۔ آغا زاہد یار خان، ہزارہ۔ ارم خلیل، سکھر۔ عبدالشکور، نواب شاہ۔ نوید احمد، نواب شاہ۔ عبدالوہاب انصاری، حیدر آباد۔ سمیرہ رحمٰن، لاہور۔ نائلہ سلطانہ، لاہور۔ شہزاد نکیم، لاہور۔ کامران الرحمٰن، لاہور۔ عشرت اقبال صدیقی، کراچی۔ ناصر علی، داؤد۔ عطا الرحمٰن بھٹی، سانگھڑ۔ محمد فیصل ہاشمی، اٹک سٹی۔ رضوان محمد سفیان، کراچی۔ سید صولت علی جعفری، حیدر آباد۔ محمد سرور، ہارون آباد۔ سرتاج علی شاہ، نوشہرہ۔ محمد تسلیم، سکھر۔ عمر فاروق صدیقی، جیکب آباد۔ عتیبہ نصیر، لاہور۔ محمد اشفاق ارائیں، وہاڑی۔ عاطف اقبال، لاہور۔ محمد اشرف گھانچی، کراچی۔ اورنگ زیب زید، آزاد کشمیر۔ راشد مہناس ثاقب، قصور۔ تابندہ ریاض، لاہور۔ قرۃالعین، کراچی۔ شازیہ سلیم، کمالیہ۔ محمد رضا ساغر، لاہور۔ تہمینہ رضا، لودھراں۔ منیر احمد، کراچی۔ حنیف ابراہیم، کراچی۔ سید محمد علی رضا، لاہور۔ شاہ مشرف عالم، لاہور۔ عمران صدیق، لالہ موسیٰ۔ محمد اعجاز پرنس، راولپنڈی۔ علی جواد، لاہور۔ سلیم رضا، لاہور۔ محمد فاروق منیر، لاہور۔ اسماعیل عبدالرحمٰن، کراچی۔ محمد فہیم منصوری، سانگھڑ۔ سبین اکرم، لاہور۔ اکبر عبدالعلی، سکھر۔ مہ جبیں اقبال، بلوچستان۔ فرخ دیبا، گوجرانوالہ۔ زبیر متین، کراچی۔ آصف محمود، راولپنڈی۔ محمد کاشف شیخ، کراچی۔ حفاظت علی خان، کراچی۔ فرحین رضا، کراچی۔

سیلاب

محمد عمر احمد خان

جس رات سیلاب آیا اس وقت غالباً دو بجے تھے۔ فیضو سویا ہوا تھا۔ وہ ہی کیا گاؤں کے سبھی لوگ سوئے ہوئے تھے۔ پانی کا چنگھاڑتا ہوا تیز ریلا جیسے ہی اس کی کچی گھاس پھوس کی جھونپڑی میں داخل ہوا، پانی کے خوفناک شور کو سُن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اسی وقت کوئی چیز بڑے زور سے اس کے سر پر لگی۔ گیلی گیلی سی۔ فیضو کی آنکھوں کے آگے نیلے پیلے ستارے ناچنے لگے۔ اس نے بابا کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"بند ٹوٹ گیا ہے۔ سیلاب کا پانی گاؤں میں گھُس آیا ہے۔"

کچھ اور آوازیں بھی فیضو کے کانوں میں پڑیں۔ مُنی کے رونے کی آواز، ماں کی گھبرائی اور سہمی ہوئی آواز، چھوٹے بھائی کی چیخ و پکار کی

آواز۔ اور پھر یہ تمام آوازیں اس سے دور ہو گئیں کیونکہ پانی کا تیز ریلا جھونپڑی کو کئی ٹکڑوں میں بکھیر کر اپنے ساتھ بہالے گیا تھا۔ اب فیضو کو صرف پانی کے شور کی بھیانک آوازیں آرہی تھیں جو اندھیرے میں اس کے پورے گاؤں کو بہا کر موت کے تاریک وادی میں لے جارہا تھا۔ پانی کے تیز شور میں کبھی کبھی بھینسوں کے چلانے اور بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سیلاب کے بے رحم مٹیالے پانی نے ان بے زبان جانوروں کو بھی نہیں بخشا تھا۔ تیز بہتے ہوئے پانی کے ریلے نے کئی بار بڑی بے دردی سے فیضو کو اوپر نیچے پٹخا لیکن چوں کہ اسے تیرنا آتا تھا اس لئے وہ پانی کے اندر ڈوبا نہیں۔ پانی کے اوپر ہی تیرتا رہا، ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ پھر اچانک ایک لکڑی کا تختہ اس کے ہاتھوں میں آگیا۔ اس نے ہمت کر کے مضبوطی سے لکڑی کے اس تختے کو تھام لیا اور سیلاب کی بے رحم موجوں کے ساتھ ساتھ بہتا رہا۔ فیضو کو کچھ نہیں یاد کہ وہ کتنی دیر تک سیلاب کے پانی میں بہتا رہا۔ پانی کے تیز تھپیڑوں نے اسے نیم مُردہ کر دیا تھا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی چیز اس کے اوپر اُڑ رہی ہے۔ اوپر سے تیز لائٹیں بھی پانی پر پھینکی جارہی تھیں۔ شاید کوئی ہیلی کاپٹر تھا۔ پھر ہیلی کوپٹر سے کوئی رسّے کے ساتھ نیچے لٹکنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد فیضو دو مضبوط ہاتھوں میں بڑی نرمی اور ملائمیت کے ساتھ دبا ہوا تھا۔

"رسی اوپر کھینچ لو جوان۔ اللہ نے بچے کو بچالیا ہے۔"

فیضو کے کانوں میں اس شخص کی آواز پڑی جس نے بڑی مضبوطی کے ساتھ اسے اپنی مہربان بانہوں میں سمیٹا ہوا تھا۔ رسّی اوپر کھینچ لی گئی۔ چار پانچ مہربان ہاتھ مزید اس کی طرف بڑھے اور انہوں نے اسے تھام لیا۔ فیضو نے نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھا، وہ سب فوجی جوان تھے۔ ایک فوجی جوان نے ہیلی کاپٹر کے فرش پر اسے اُلٹا لٹا دیا اور دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر اس کے پیٹ سے سیلاب کا مٹیالا پانی نکالنے لگا جو منہ کے راستے اس کے پیٹ میں چلا گیا تھا۔ فیضو کو سخت تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوب رہا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

فیضو کو جب ہوش آیا وہ ایک کیمپ میں تھا جہاں بہت سارے بچے، بوڑھے جوان تھے۔ یہ سب سیلاب میں ہلاک ہونے سے بچ گئے تھے۔ انہیں عارضی طور پر کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ فیضو ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی دو تین چارپائیاں اور بھی تھیں، جس پر کچھ اور افراد بھی تھے جو شاید بیمار تھے۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر ایک نوجوان (جو کہ سفید گاؤن پہنے ہوئے تھا) اس کے قریب آیا۔ نوجوان نے فیضو کی نبضیں چیک کیں، اس کی آنکھوں کا معائنہ کیا۔ پھر

مسکراتے ہوئے اس نے کہا "اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ اس لئے یہ بستر چھوڑ دو تاکہ ہم اس پر کسی دوسرے مریض کو لٹا سکیں۔"

فیضو بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نیا مریض آگیا تھا۔ ڈاکٹر نئے مریض کا معائنہ کرنے لگا۔

فیضو وہاں سے کھسک گیا اور کیمپ میں گھوم پھرنے لگا۔ پورے کیمپ میں کہرام مچا ہوا تھا۔ بے رحم سیلاب نے کتنے ہی خاندانوں کو اُجاڑ دیا تھا۔ کھیتیاں تباہ کر دی تھی، مکانات گرا دیئے تھے اور کتنی ہی جانوں کو نگل چکا تھا اور اب سندھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فیضو کو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اچانک کیمپ میں اعلان ہوا۔

"سب لوگ قطار بنالیں، کھانا تقسیم کیا جارہا ہے۔"

یہ اعلان سنتے ہی ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ کھانا لینے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگے۔ فیضو سوچنے لگا "کیا یہ تمام لوگ قطار میں لگ کر کھانا حاصل نہیں کر سکتے؟" جب تمام لوگ کھانا حاصل کر چکے تو تب وہ اس دیگ والے کے قریب گیا جو دیگ میں سے چاول نکال کر لوگوں میں بانٹ رہا تھا۔

"ہاں بھئی! تیری پلیٹ کدھر ہے؟" دیگ والے کا لہجہ خاصا کرخت تھا۔ فیضو کے پاس کوئی پلیٹ یا برتن نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی قمیص کا دامن دونوں ہاتھوں سے تھام کر سوالی کی طرح پھیلا دیا۔ کرخت لہجے والے نے ڈونگا بھر کر گرم گرم چاول اس کی جھولی میں ڈال دیئے۔ وہ ایک طرف بیٹھ کر جلدی جلدی چاول حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ بھوک بہت تیز تھی اس لئے چاول بہت اچھے لگے لیکن ان چاولوں میں چنے نہیں تھے۔

ذرا سوچئے تو سہی

محبت ایک خوش کن لفظ ہے۔ انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو، جس کے بغیر زندگی بے کیف اور نامکمل ہے۔ جیسے ایک گلشن گلوں کے بغیر، ایک جسم روح کے بغیر اور گھر مکینوں کے بغیر، لیکن آج کے اس تیز رفتار دور میں تو ہر کوئی دولت، شہرت سے محبت کرتا ہے، دین و آخرت تک بھلا بیٹھا ہے۔ اگر سوچیں تو یہی جذبہ تباہی کے بجائے مشعلِ راہ بن سکتا ہے، دوسروں کو خوشیاں فراہم کر سکتا ہے، پریشان حال لوگوں اور بزرگوں کی زندگی کا سہارا بن سکتا ہے۔

کتنی بہنیں ایسی ہیں جن کے سر بھائیوں کے ہاتھوں آنچل اوڑھنا چاہتے ہیں، کتنی مائیں ایسی ہیں، جن کی آنکھیں بیٹیوں کے روپ میں آنکھوں کی ٹھنڈک کو ترستی ہیں، کتنے باپ ایسے ہیں جن کے بڑھاپے کے سہارے چھن چکے ہیں۔ آخر ہم اپنی محبت کو ان رشتوں کیلئے کیوں وقف نہیں کر دیتے اور انسانیت کی معراج کیوں نہیں پالیتے۔

مرسلہ..... محمد سعید گلاب

اس کی ماں چنے والے چاول پکاتی تھی۔ بے حد لذیز۔ ماں کا خیال آتے ہی فیضو کے حلق میں جیسے پھندا سا لگ گیا۔ اس نے جیسے تیسے کر کے چاول حلق کے نیچے اتارے۔ پانی پیا پھر کیمپ سے ذرا دور جا کر ایک درخت کے سہارے ٹیک لگا کر لیٹ گیا۔ آنکھیں موند لیں۔ پہلے ماں یاد آئی پھر مُنی، پھر ننھا اور پھر بابا یاد آیا جو زمیندار کے کھیتوں میں بڑی محنت سے دن رات کام کیا کرتا تھا، پھر بھی زمیندار جھڑکیاں دیتا تھا کہ بڈھا کام چور ہے، کام صحیح نہیں کرتا۔ اس کا بابا غریب آدمی تھا لیکن محنت و مشقّت کر کے اسے پڑھا رہا تھا۔ جب فیضو پانچویں جماعت میں پورے اسکول میں اوّل آیا تھا تو بابا بہت خوش تھا۔ اتنا خوش کہ خوشی کے مارے بابا کے آنسو نکل آئے تھے۔ فیضو کا منہ چوم کر بابا نے کہا تھا "توں بڑا لائق ایں پتر! میں تینوں ڈاکٹر بناواں گا تے ودھیاتے اُچی تعلیم واسطے شہر بھیجاں گا۔" (بیٹا! تو بڑا لائق ہے۔ میں تجھے ڈاکٹر بناؤں گا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے شہر بھیجوں گا)

لیکن سیلاب نے سارے خواب بکھیر دیئے تھے۔ ماں، مُنی، ننھے اور بابا کا خیال آتے اور اس احساس کے ساتھ کہ اب دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ فیضو کی پلکوں پہ آیا ہوا سیلاب ضبط کے سارے بندھن توڑ کر بہہ نکلا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ چوں کہ وہ کیمپ سے کافی دور لیٹا تھا اس لئے اس کے رونے کی آواز لوگوں تک نہ گئی اور وہ ماں باپ اور بہن بھائی کو یاد کرتے کرتے، روتے روتے نہ جانے کب سو گیا۔

کچھ دن تک وہ امدادی کیمپ میں رہا پھر لاہور چلا آیا۔ لاہور آکر وہ بے حد حیران ہوا۔ اونچی اونچی بلڈنگیں، سڑکوں پر دھواں اُڑاتی موٹر کاریں، بسیں اور اسکوٹریں دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گیا۔ دوپہر ہوتے ہی اس کے پیٹ میں بھوک سے مروڑ اٹھنے لگی۔ اس وقت وہ ایک ہوٹل کے باہر کھڑا تھا۔ بہت سارے لوگ ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ پورا ہوٹل کھانوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ فیضو بہت بھوکا تھا لیکن اس کی جیب میں پیسے دھیلے نہیں تھے۔ وہ باہر کھڑا ہو کر بڑی للچائی ہوئی نظروں سے کھانا کھاتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔

ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر بہت سارے مانگنے والے بیٹھے تھے۔ ہوٹل کا ملازم ان میں روٹیاں تقسیم کرنے لگا۔ فیضو کا دل چاہا کہ وہ بھی دوڑ کر جائے اور مانگنے والوں میں شامل ہو جائے لیکن اسے بابا کی بات یاد آگئی جو کہتا تھا۔ "جرا ہتھ اک واری منگن واسطے اُٹھ جاوے فیر او ساری عمر دوجیاں دے اگے پھیلیا ای رہندا اے۔" (جو ہاتھ ایک بار مانگنے کے لئے اُٹھ جائے وہ پھر ساری عمر پھیلا ہی رہتا ہے۔)

ہوٹل کے بوڑھے ملازم نے روٹیاں تقسیم کرنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی فقیر بچ گیا ہو۔ اسے ایک کونے میں کھڑا فیضو نظر

آیا۔ "لے بھئی پُتر! اپنے حصے کی روٹی۔" بوڑھے ملازم نے بڑی سی روٹی فیضو کی طرف بڑھائی۔ فیضو نے للچائی ہوئی نظروں سے روٹی کی طرف دیکھا پھر ہوٹل کے بوڑھے ملازم سے کہا "بابا جی! میں بھوکا ضرور ہوں لیکن بھکاری نہیں۔" "پتر! تو تو بڑا خوددار لگتا ہے۔ اچھا یہ بتا۔ ہوٹل میں کام کرے گا؟" بوڑھے ملازم نے فیضو سے پوچھا تو فیضو نے "ہاں" میں سر ہلا دیا۔

اس ہوٹل میں فیضو کو کام بھی مل گیا اور رہنے کے لئے جگہ بھی۔ فیضو نے دل لگا کر کام کیا اور ایک ہی ہفتے میں اس نے اپنی محنت سے ہوٹل کے مالک کا دل جیت لیا۔ دو وقت کا کھانا، دو وقت کی چائے مفت اور دس روپے روز کی تنخواہ۔ فیضو نے حساب لگایا۔ مہینے کے تین سو روپے بنتے تھے فیضو سوچنے لگا اللہ کتنا اچھا ہے۔ میرے تمام سہارے چھن گئے تو اس نے پیٹ بھرنے کے لئے اچھا کھانا دیا اور رہنے کو جگہ بھی دی سونے کے لئے۔

فیضو کے پاؤں تو جم گئے تھے لیکن سیلاب ابھی رُکا نہیں تھا۔ اس کی تباہی کا دائرہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، ہوٹل، چوراہے ہر جگہ سیلاب ہی کا چرچا تھا۔

فیضو نے اخبار میں پڑھا تھا۔ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے لوگ پنجاب میں سیلاب کی تباہ کاریوں پر تڑپ اُٹھے تھے۔ دھڑا دھڑ امدادی اشیا دوسرے صوبوں سے پنجاب آرہی تھیں۔ تمام ملک میں جگہ جگہ امدادی کیمپ کھُل گئے تھے۔ پاکستانی قوم متحد ہو کر ایک دوسرے کے دُکھ درد میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔

ایک شام فیضو ہوٹل کے کام سے فارغ ہونے کے بعد جب ایسے ہی تفریح کے ارادے سے مینارِ پاکستان کے قریب سے گزرا تو اس نے دیکھا، وہاں سیلاب زدگان کی امداد کے لئے ایک بڑا سا کیمپ لگا تھا جہاں امدادی اشیا، دوائیں، کھانے پینے کا سامان، کپڑے اور نقدی رقوم جمع ہو رہی تھیں۔

فیضو کا دل تڑپ اُٹھا۔ اس نے سوچا کہ ہوٹل میں کام کر کے تو وہ واقعی سیلاب زدہ لوگوں کو بھول ہی چکا ہے۔ ملک پر سیلاب زدہ لوگوں کی مدد کی اپیل کی جارہی تھی۔ فیضو نے وہیں کھڑے کھڑے کچھ فیصلہ کیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چاندی کا کڑا تھا۔ یہ کڑا اس کی ماں نے اپنا پیٹ کاٹ کر اس کی پیدائش پر بنایا تھا کیونکہ وہ بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔

فیضو نے ہاتھ سے کڑا اُتارا اور امدادی سامان لینے والے شخص کی میز پر رکھا اور تیزی کے ساتھ واپس پلٹ پڑا۔ وہ وہاں زیادہ دیر رک ہی نہیں سکتا تھا۔ کیمپ کے قریب ہی ایک پارک تھا۔ اس کی بنچ پر اکڑوں بیٹھ کر فیضو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ تمام رشتوں کو کھو دینے کے بعد ماں کی جو آخری نشانی اس کے پاس بچی تھی سیلاب پر بند باندھنے کے لئے اس نے وہ نشانی بھی اپنی قوم پر قربان کر دی تھی۔

دُعا کے لئے اُٹھے اِن ہاتھوں کا دُکھ محسوس کیجئے!

سیلاب زدگان کی مدد میں
مصروف کسی بھی رجسٹرڈ
فلاحی ادارے یا تنظیم کے پاس
اپنے عطیات جمع کرائیے۔

جاری کردہ:
آل پاکستان
نیوز پیپرز سوسائٹی

چیزوں کی کہانی

کیل اور ہتھوڑی

آصف فرخی

کیل اور ہتھوڑی میں گہرا تعلق ہے۔ کیل لکڑی کا سینہ چیر دیتی ہے لکڑی کے تختوں کو آپس میں پیوست کر دیتی ہے۔ اگر کیل ادھر ادھر ہونے لگے تو ہتھوڑی اسے سیدھا کر دیتی ہے۔ ہتھوڑی کی چوٹ سے کیل، لکڑی میں یا دیوار میں اندر تک جاتی ہے۔ کیل اور ہتھوڑی دونوں مل کر تعمیر کو ممکن بناتے ہیں۔

ایک دن، ماقبلِ تاریخ کے آدمی نے ہڈی پر لگا ہوا گوشت کھانے کے بعد، ہڈی کے اندر کے نرم گودا کھانے کے لئے پتھر کا ٹکڑا اٹھالیا، اور ہڈی پر دے مارا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان نے اس طرح کچلنے والا اوزار استعمال کرنا شروع کیا۔

انسان کو جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ کسی چیز کو کچلنے یا توڑنے کے لئے پتھر ہاتھوں سے زیادہ بہتر ثابت ہوتے ہیں اور اس طرح چوٹ بھی نہیں لگتی۔

شروع میں تو یہ ہوا کہ جیسا پتھر مل گیا، اٹھالیا اور اسے کام میں لے آئے۔ مگر اس کے بعد پتھروں کو چن چن کر مناسب اور مضبوط ٹکڑے تلاش کئے جاتے۔ اور اس وضع کے پتھر نہیں ملتے تو انسان نے ان پتھروں کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنا سیکھ لیا۔ پتھروں کو تراش کر ایسا بنالیا جاتا کہ پکڑنے میں آسانی ہو، اور پھر بھی اتنے مضبوط رہیں کہ ان سے زور دار ضرب لگائی جاسکے۔ ایسے پتھر ہتھوڑے کی پہلی شکل تھے۔

پتھر کے ان ہتھوڑوں سے کام لینا کوئی آسان نہیں تھا۔ انہیں سنبھال کر پکڑنا، اور اس طرح چوٹ لگانا، کہ پورا وار پڑے اور ہاتھ نہ کچلنے پائیں، اس کے لئے خاص مہارت اور مشق کی ضرورت تھی۔ جو لوگ یہ ہنر سیکھ لیتے، وہ کاریگر بن جاتے۔ ان ہی کاریگروں نے وہ ابتدائی اوزار ڈھالے جن سے دنیا کے پہلے کسانوں نے زمین میں بیج بوئے اور فصل اگائی۔

یہ سارے ضروری اور لازمی اوزار ان

کاریگروں کے تجربات سے تخلیق ہوئے۔ ان ہی میں سے کسی کاریگر نے پتھر کے ہتھوڑے کو چمڑے کے تسموں اور گھاس کی تیلیوں کے ذریعے لکڑی کے ایک ٹکڑے سے باندھ دیا۔ کچھ عرصے کے بعد، کسی اور کاریگر نے پتھر میں سوراخ کر کے لکڑی کا ٹکڑا اس میں پھنسا دیا۔ اب ہتھوڑے کو دستہ مل گیا، اور اسے اٹھانا، پکڑنا اور اس سے کام لینا آسان ہو گیا۔

ہتھوڑے کے ساتھ نت نئے تجربے ہوتے رہے۔ لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر استعمال کئے جانے والے ہتھوڑوں کی چوٹ زیادہ زور دار ہوتی ہے، اور چوٹ کا دارومدار دستے کی لمبائی اور شکل پر ہوتا ہے۔

ہتھوڑے نے لپنا لوہا منوالیا، اور اپنی افادیت کا احساس دلایا۔ ہتھوڑے کے استعمال کی مشق ہوئی تو تعمیر کو ترقی ملی۔ گھر، عمارتیں، مقبرے اور عبادت گاہیں، ان سب کی ابتداء ہتھوڑے کے استعمال سے ہوئی۔ قدیم بابل کی عبادت گاہیں اور مصر کے اہرام اس چھوٹے سے ہتھوڑے کے بغیر بن نہیں سکتے تھے۔ اس سادہ سے اوزار کی بدولت ہی یہ شاندار عمارتیں وجود میں آئیں۔

ان عمارتوں میں استعمال ہونے والے پتھروں کی تراش خراش ہتھوڑے کے ذریعے ہوئی۔

جب انسان نے دھات دریافت کر لی، تو یہ ہتھوڑا ہی تھا جو ان کو ٹھونک پیٹ کر استعمال کے قابل بناتا۔

ہتھوڑے کے استعمال بدلتے گئے تو ہتھوڑے کی شکلیں بھی بدلتی گئیں۔ موچی، لوہار، سنار، بڑھئی، معمار اور کان کن سب محنت کشوں کے پاس اپنے اپنے استعمال کے ہتھوڑے ہونے لگے، جو کسی نہ کسی مخصوص کام کے لئے بنائے گئے تھے۔ گھروں میں عام استعمال کے لئے جو چھوٹا اوزار بنایا گیا، اسے ہتھوڑی کہا جانے لگا۔

صدیوں کے سفر میں ہتھوڑی نے بہت سی شکلیں بدلی ہیں، مگر اس کی ضرورت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

مشینوں اور طرح طرح کے آلوں کے اس دور میں، ہتھوڑی کی اہمیت آج بھی باقی ہے۔ انجینئر اور مکینک، مرمت کرنے والے اور تعمیر کرنے والے، سبھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ ہتھوڑی نے اپنا کام نہ دکھایا ہوتا تو زمین کی تہہ اور خلا کی وسعت کے سربستہ راز، انسان پر یوں شاید نہ کھلے ہوتے۔

ہتھوڑی کی ساتھی کیل ہے۔ یہ نہ ہو تو ہتھوڑی کی کاریگری ادھوری ہے۔ یہ چھوٹی سی ہے، مگر گھنی اور مضبوط ہے۔ ہتھوڑی کی مار اپنے سر پر سہتی ہے، اور گہری اترتی جاتی ہے۔

کیل بھی پرانے زمانے کی دریافت ہے۔ ہزاروں برس پرانی آشوری تہذیب کے کھنڈروں سے لوہے کی کیلیں ملی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کیل استعمال ہوتی تھی۔ قدیم روم کے سپاہی اپنے جوتوں میں کیلیں لگا لیتے تھے

تاکہ جوتے زیادہ عرصے تک چل سکیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یوروپ میں محل اور قلعے کے دروازوں پر کیلیں ٹھونک لی جاتی تھیں۔ کہ دروازے کی لکڑی کو اور مضبوط کر دیں۔

کیل بظاہر بڑی صابر معلوم ہوتی ہے مگر دوسروں کو تکلیف دینے کا کام بھی خوب جانتی ہے۔ پرانے زمانے میں صلیب پر چڑھانے کی سزا عام تھی۔ مجرم کے ہاتھ اور پاؤں میں بڑی بڑی کیلیں، جنہیں میخ کہا جاتا ہے، ٹھونک دی جاتی تھیں۔ یوروپ میں لوگوں سے اقبالِ جرم کرانے اور انہیں اذیت پہنچانے کے لئے ایک بھیانک طریقہ اختیار کیا گیا۔ ایسے لوگوں کو لوہے یا دھات کے پنجرے نما ڈبے میں بند کر دیا جاتا جن کے اندرونی حصے پر تمام کیلیں جڑی ہوئی ہوتیں۔ انہیں "دوشیزۂ فولاد" کہا جاتا ہے۔ کیل کی یہ چبھن آج بھی محسوس ہوتی ہے!

کیل کا استعمال بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ کیل کی قیمت بھی۔ پرانے زمانے میں کیل ہاتھ سے بنائی جاتی تھی، اس لئے بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی۔ راہ چلتے، سڑک پر کیل مل جائے تو لوگ اسے اٹھا کر احتیاط سے رکھ لیتے۔ سترھویں صدی میں گھوڑا گاڑی اور کوچ پر کیلوں سے آرائش کی جاتی، اور ایسی کوچ کو بہت خوبصورت سمجھا جاتا۔

مغلیہ دور کی عالی شان عمارتوں کی تعمیر میں بھی کیل نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔

آسان راستہ

○ ..... گائیڈ سیاح کو پہاڑی دکھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس پہاڑی سے جو بھی گیا واپس نہیں آیا۔ سیاح خوفزدہ ہو کر کہنے لگا تو پھر وہ کہاں گیا۔

گائیڈ نے کہا دوسری طرف کے آسان راستہ سے اتر گیا۔

(یاسر محمود۔ اٹک)

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____

آنکھ مچولی البم

اسے کہتے ہیں سر کا بوجھ اتارنا !

(مرتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں تو ڈاکٹر موت کے خوف سے کانپ اٹھا)

اسٹالن

روس کا جلاد حکمران

فواد الظفر خان

اسٹالن..... جی ہاں! اسٹالن روس کا جلاد صفت فرماں روا جس نے تقریباً تیس سال تک روس پر حکمرانی کی۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے پاس اتنے اختیارات تھے کہ یورپ کا کوئی سربراہ مملکت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے لاکھوں افراد کو صرف ایک اشارے سے ہلاک کروا دیا تھا۔

اس کے رعب و دبدبے کا یہ عالم تھا کہ خروشیف نے جو اس کے انتقال کے بعد روس کا وزیر اعظم ہوا۔ ایک مرتبہ کہا تھا کہ جب کبھی ہم وزراء میں سے اسٹالن کے روبرو کسی کی طلبی ہوتی تو ہم اس کے سامنے جانے سے پہلے اپنے بیوی بچوں اور عزیزوں سے آخری ملاقات کر کے جایا کرتے تھے کیوں کہ اس کے سامنے سے زندہ واپس آنے کا کسی کو یقین نہیں ہوتا تھا۔ اسٹالن نے حکومت کا کوئی چھوٹا، بڑا عہدہ قبول نہیں کیا۔ وہ تمام عمر کمیونسٹ پارٹی کا صرف سیکریٹری رہا لیکن عملاً اسے کسی بادشاہ کی طرح اختیارات حاصل تھے۔

اسٹالن کی نجی زندگی کوئی پُرکیف و پُرمسرت نہیں تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی غربت و افلاس میں

کئی۔ وہ دسمبر ۱۸۷۹ء میں ایشیا کے مغربی شمالی کوہ قاف کے علاقے جارجیہ کے ایک دیہات "گوری" میں پیدا ہوا۔ اس کا اصل نام جوزف وساریونووچ ژوگاشولی تھا۔ اس کے والدین قدیم نوابوں کی رعایا تھے وہ نہایت غریب لوگ تھے۔ اسٹالن کی پیدائش سے کچھ عرصے قبل اپنی غلامانہ زندگی سے انھیں آزادی نصیب ہوئی تھی۔ اسٹالن کا باپ بے انتہا شراب پیا کرتا تھا اور پیشے کے لحاظ سے موچی تھا جو گاؤں کے لوگوں کے جوتے مرمت کر کے گزر اوقات کرتا تھا۔ اس کی ماں بستی کے لوگوں کے میلے کپڑے دھوتی اور تھوڑی بہت سلائی کرتی جس سے تھوڑا بہت کما لیتی اور اس طرح گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ مگر اس مفلسی کے باوجود انھوں نے بجائے اس کے جوزف اسٹالن سے محنت مزدوری کرواتے اس کو گاؤں کے کلیسائی حلقے کے اسکول میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بٹھا دیا۔ اس کے ماں باپ جو مذہبی عقیدے کے بڑے پکے تھے، اسٹالن کو پادری بنانا چاہتے تھے۔ اسٹالن کے باپ کی وفات کے بعد اس کی ماں نے اسے شہر طفلس کی مشہور دینی درسگاہ میں داخل کرا دیا جہاں جوزف اسٹالن نے مذہبی تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ روسی زبان بھی سیکھ لی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ اس درسگاہ میں پادریوں، راہبوں اور دیگر مذہبی رہنماؤں کی مذہب پر اجارہ داری، ناجائز اقتدار، لوٹ کھسوٹ، تعصب، ہٹ دھرمی اور موجودہ علوم و فنون سے ان کی لاعلمی و قومی جہالت کو دیکھ کر اس ماحول سے نفرت ہو گئی اور اس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا جس کی وجہ سے اسے اس درسگاہ سے نکال دیا گیا۔

مذہبی یونیورسٹی سے باہر آ کر جوزف اسٹالن نے باطوم (جارجیہ ایشیا) کے علاقے میں ایک کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم بنائی۔ جب اس پارٹی کے اخراجات کے لئے اسے رقم کی ضرورت پڑی تو اس نے اپنی پارٹی کے چند مسلح ممبروں کے ساتھ جا کر ایک بینک لوٹ لیا جس کے نتیجہ میں اس کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ قید کاٹنے کے بعد جب وہ باہر آیا تو اس کو پارٹی کا خرچ چلانے کے لئے پھر رقم کی ضرورت پڑی اس دفعہ اتفاق سے روسی اسٹیٹ بینک کا ایک سرکاری ٹرک شاہی خزانے سے لدا ہوا سڑک پر جا رہا تھا کہ کسی نے جھپٹ کر جوزف اسٹالن کو خبر کر دی۔ یہ سنتے ہی جوزف نے اپنی پارٹی کے ساتھ ٹرک پر ہلہ بول دیا اور سارا خزانہ لوٹ لیا۔ گرفتاری کے بعد اسے سائبیریا کے جنگلی برفانی خطہ کی طرف جلاوطن کر دیا گیا جہاں سے وہ کسی نہ کسی طرح نکل بھاگا اور زارِ روس کی حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں لگ گیا اسے پانچ مرتبہ گرفتار کر کے سائبیریا کے برفانی جنگلوں میں جلاوطن کیا گیا لیکن وہ ہر دفعہ صحیح سلامت نکل آیا اور حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا۔ گرفتاریوں سے بچنے کے لئے اس نے ایک درجن سے زیادہ اپنے نام رکھ لئے تھے۔ مثلاً سیسی، سانیکی، کوبا وغیرہ۔ جب اس نے اپنا آخری

نام اسٹالن (آہنی شخصیت والا) رکھا اور ماسکو آیا تو لینن کی پارٹی بالشویک میں شمولیت اختیار کرلی۔ جب پارٹی کے کسی جلسے میں لینن کی ملاقات اسٹالن سے ہوئی تو لینن اس کی علمی معلومات اور تنظیمی صلاحیت سے بہت متاثر ہوا اور اس کو اپنا دستِ راست بنالیا۔ چنانچہ لینن کی وفات کے بعد اسٹالن ہی اس کا جانشین ہوا اور اس نے روس کی تاریخ بدل ڈالی۔

اسٹالن نے روسیوں کو جو مغربی یورپ میں جاہل، اجڈ اور تحقیراً قطب شمالی کے سفید ریچھ کہلاتے تھے ایک عسکری قوت بنادیا۔ روس کا پہلا دستور بھی اسی نے بنایا اور ایک اخبار پرودا (یعنی سچائی) بھی جاری کیا۔ یہ اخبار سرکاری ترجمان کہلاتا رہا اور کچھ عرصے تک اسٹالن اس اخبار کا اوّلین ایڈیٹر بھی رہا۔

اسٹالن کی زندگی کے آخری دن بڑے غم ناک تھے۔ ایک مرتبہ ایک امریکی اخبار نیو یارک ٹائمز میں اسٹالن کے متعلق ایک مقالہ چھپا جس میں بتایا گیا تھا کہ جوزف اسٹالن پیدائشی شکی مزاج واقع ہوا تھا۔ وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا یہاں تک کہ اسے اپنے بیوی بچوں پر بھی اعتبار نہیں تھا۔ وہ ان سب سے علیحدہ اور تنہا رہا کرتا تھا۔ اس کی بیٹی اس کے ظلم سے تنگ آکر یورپ فرار ہوگئی تھی۔ اسٹالن کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں تو اس نے خود کو ایک قیدی بنا لیا تھا اور صرف ضروریات کے وقت باہر نکلتا تھا۔

ماسکو شہر سے چالیس پچاس میل دور کسی پرانے نواب کا ایک حصار بنا ہوا تھا جس کے تین بڑے دروازے تھے۔ تیسرے اور آخری دروازے کے بعد ایک چھوٹا باغیچہ تھا جس کے عقب میں ایک مضبوط اور بلند محل تھا۔ اسٹالن اس محل میں تنہا رہا کرتا تھا۔ اس کی بیوی بچے اس کے وطن جارجیہ میں رہتے تھے جن کو دیکھنے وہ کبھی کبھی وہاں چلا جایا کرتا تھا۔ اس کا روز کا معمول تھا کہ وہ صبح کو ماسکو کے شاہی محل میں جہاں اس کا دفتر تھا، چلا جاتا تھا اور تمام دن حکومت کے انتظامی امور انجام دینے کے بعد شام کے وقت محل میں واپس آجاتا تھا۔ جس میں انتہائی حفاظتی تدابیر کی گئی تھیں۔ محل کے ہر دروازے پر چوبیس گھنٹے مسلح گارڈ کا پہرہ رہتا تھا۔ ہر اندر جانے اور باہر آنے والوں کی خواہ وہ کوئی بھی ہو، ان دروازوں سے گزرنے کے لئے پوری تلاشی لی جاتی تھی جس کے لئے خفیہ پولیس کا خاص عملہ مقرر تھا۔ اس کے بعد باغیچہ و محل کے درمیان داخلے سے پہلے آخری تلاشی لی جاتی تھی جس کے لئے اسٹالن کی قوم اور اس کے گاؤں کے مخصوص افراد تعینات تھے جو لمبے تڑنگے اور ڈراؤنی شکل کے ہوتے تھے۔ وہ لوگ اپنی مقامی جارجیہ کی زبان بولتے اور ہر آنے والے کو قہر کی نظر سے دیکھتے اور اس کے ساتھ دشمن کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ ان تمام مقامات کی سخت چیکنگ کے بعد پھر کہیں کسی کو اسٹالن کے روبرو جانے کی

اجازت دی جاتی تھی۔

محل کے عقبی حصہ میں کچھ تبدیلیوں کے بعد اسٹالن کے لئے تین مخصوص کمرے ایک ہی نقشے کے مطابق ایک جیسی شکل وصورت کے بنائے گئے تھے جن میں ضرورت کے مطابق موجودہ مشینی آلات بھی نصب کئے گئے تھے۔ رات کے وقت ان میں سے کسی ایک کمرے میں اسٹالن چپکے سے اندھیرے میں جا کر سوجاتا تھا۔ ہر روز کمرہ تبدیل کیا جاتا تھا تاکہ یہ کسی کو نہ پتا چل سکے کہ آج وہ کس کمرے میں سویا ہوا ہے۔ ان کمروں کے باہر ایک دالان تھا جہاں پیچھے کی طرف باہر جانے کے لئے ایک مضبوط چھوٹا سا زمین دوز چور دروازہ بنا ہوا تھا جس میں ایک گھنٹی اور چند آلات لگے ہوئے تھے۔ اس دروازے سے ذرا فاصلے پر محل کا باورچی خانہ تھا جس کے تمام ملازمین اسٹالن کے ہم وطن اور اس کی زبان بولنے والے تھے جن پر اس کو قدرے بھروسہ تھا۔ صبح ناشتہ کی تیاری کے بعد جب یہاں سے گھنٹی بجائی جاتی تو وہ اسٹالن کے کمرے میں بھی بجتی جس پر وہ بغیر باہر نکلے اندر بٹن دبا کر زمین دوز دروازہ کھل دیتا۔ ملازم دالان میں کھانا رکھ کر چلا جاتا تو دروازہ خود بخود بند ہوجاتا جس کے بعد اسٹالن کمرے سے باہر نکلتا اور ناشتہ کر کے گھنٹی بجا کر کمرے میں چلا جاتا۔ دروازہ کھل جاتا۔ ملازم اندر سے برتن اٹھا کر لے جاتا تو دروازہ پھر بند ہوجاتا۔

یہ اسٹالن کی زندگی کا معمول تھا۔ وہ کبھی کسی سے نہیں ملتا تھا۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران وہ امریکہ کے صدر روزویلٹ اور انگلینڈ کے وزیراعظم سرونسٹن چرچل سے ملاقات کرنے پر بمشکل راضی ہوا تھا جس کے لئے وہ دونوں تہران (ایران) آئے تھے۔ ایک دن حسبِ معمول اسٹالن اپنی جائے پناہ سے باہر نکلا ہی تھا کہ اس پر فالج کا فوری حملہ ہوا جس پر اس نے جلدی سے گھنٹی بجائی اور فرش پر گر پڑا گھنٹی کی آواز پر دروازہ کھلا خادم دوڑتے ہوئے آئے۔ فوراً ہی بعد روس کے چوٹی کے ڈاکٹروں کی ٹیم پہنچ گئی۔ ڈاکٹروں کی ٹیم اسٹالن کا معائنہ کر رہی تھی کہ اچانک اسٹالن کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ دیکھ کر لوگ ٹھٹک گئے کہ شاید کہیں وہ کسی کے قتل کا حکم نہ دے دے۔ کیوں کہ روس کی بدنام خفیہ پولیس کا سربراہ اور اسٹالن کا خاص الخاص جلاد پاس کھڑا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں پھر فوراً ہی بند ہوگئیں۔ نئے روس کا عظیم معمار، اس کا بے تاج بادشاہ عظیم اسٹالن اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے چکا تھا۔ اسٹالن کے بعد خروشیف نے روس کا اقتدار سنبھالا۔ اس نے اسٹالن کے مظالم دیکھ رکھے تھے۔ چنانچہ اس نے اسٹالن کی لاش قبر سے نکلوا کر پھنکوا دی۔ یہ تھا ایک آمرِ وقت کا انجام۔

ان سے تعاون کیجیے ان پر اعتماد کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے

اور نگر نگر

ہر ماہ باقاعدگی سے

آنکھ مچولی

پہنچانے کے لیے ہم نے

ان اداروں

کو اپنا باقاعدہ

ایجنٹ

مقرر کیا

ہے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۳۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نواب شاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولا بخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

آنکھ مچولی

خریدنے کے لیے

اپنی تجاویز اور مشوروں کے لیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط وکتابت کے لیے ماہ نامہ آنکھ مچولی، ۱-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

مدد

علی اکبر تصور

"یہ لوگے..... فائدے کا سودا ہے۔" آنے والے نے اپنا منہ تقریباً اس کے کان سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا ہے یہ.....؟" وہ حیرت سے بولا اور آنے والے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ پینتالیس برس کا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ سر کے بال وقت سے پہلے سفید ہو چکے تھے۔ صرف کن پٹیوں پر بال سیاہ تھے۔ ان میں بھی چاندی کی سی تاریں چمک رہی تھیں۔ چہرے پر معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں کپڑے کا تھیلا پکڑ رکھا تھا جس میں کوئی وزنی سی چیز بند تھی۔

"مجھے اپنے بچے کی داخلہ فیس دینی ہے۔ یہ لے لو..... قیمت جو چاہے دے دو، لیکن میں ضرورت مند ہوں، اس لئے خیال رکھنا۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"پر یہ ہے کیا؟....."

"یہ..... یہ ریڈیو ہے۔" اس نے تھیلے کا منہ کھولتے ہوئے ایک بڑا سا ریڈیو نکال کر میز پر رکھ دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"میں اسے نہیں خرید سکتا..... کسی اور دکان

پر جاؤ....."

"دیکھئے میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔ اگر ضرورت نہ ہوتی تو میں یہاں کبھی نہ آتا، کل تک میرے دو بچوں کی داخلہ فیس جمع نہ ہوئی تو ان کا پورا سال ضائع ہو جائے گا۔ اسکول میں داخلے کی کل آخری تاریخ ہے۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ "ضرورت مند تم ہو میں نہیں اور میں تمہارے جھانسے میں نہیں آنے والا..... دکان سے باہر نکل جاؤ۔" "جاتا ہوں جی..... لیکن آپ نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔" اتنا کہہ کر وہ دکان سے باہر نکل آیا۔ سامنے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر اس نے صنم الیکٹرونکس کی پروقار عمارت پر ایک نظر دوڑائی۔ عمارت کی پیشانی پر نیون سائن چمک رہا تھا۔ شام رات میں ڈھلنے لگی تھی۔ لوگ بازار میں ٹہل رہے تھے۔ خریداری کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا کا ہر فرد خوشحال ہے اداس ہے تو صرف وہی ہے۔ اچانک ہی ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"توقیر! تم یہاں کھڑے ہو؟" آواز اس کے لئے شناسا تھی۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو عارف چلا آرہا تھا۔ اس نے کپڑے کے تھیلے کو اپنے پیچھے چھپالیا۔ اور مسکرانے لگا۔

"خیر تو ہے توقیر....." عارف نے قریب آکر مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں دوست! بس تمہاری طرح ذرا سیر کرنے نکل آیا تھا۔" وہ مسکرایا۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ میں اس وقت سیر کے لئے نکلتا ہوں۔ ویسے اس وقت میں دفتر سے واپس آرہا ہوں۔" لہجہ حیرت لئے ہوئے تھا۔

"آخر دوست ہوں تمہارا....." توقیر نے مختصراً جواب دیا۔

"یہ تم نے اپنے پیچھے کیا چھپا رکھا ہے؟" اس نے جلدی سے کہا اور تھیلے کو جھپٹ لیا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائلیں توقیر کو پکڑائیں اور پھر تھیلا کھول ڈالا۔

"ارے یہ تو ریڈیو ہے۔ نیا لگتا ہے، خریدا ہے کیا؟" اس نے اپنے مخصوص انداز میں بولتے ہوئے کہا۔

"..... ہاں..... خریدا ہے۔" توقیر نے خشک گلے کو تر کرنے کے لئے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ وہ اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ عارف اس کا مخلص دوست تھا۔ وہ اپنے کسی دوست کو آزمائش میں ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا۔ عارف ایک پرائیویٹ دفتر میں ملازم تھا۔ ریڈیو کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس نے ریڈیو توقیر کو تھما دیا اور پھر فائلیں اس سے لے لیں۔

"یار توقیر..... دفتر میں فائلوں کو مکمل نہیں کر سکا۔ سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اب فائلوں کو گھر لے جا رہا ہوں۔ رات میں ان سے فارغ ہو جاؤں گا۔ تم یہ اپنا تھیلا مجھے دے دو۔ صبح لے لینا۔" عارف نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔ توقیر

نے جواب دیئے بغیر کپڑے کا تھیلا اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور پھر عارف سے اجازت لیکر آگے بڑھ گیا۔ ریڈیو کو بیچنے کے لئے ابھی بہت سی دکانیں موجود تھیں۔

توقیر کو جاتے دیکھ کر عارف نے لمبا سانس لیا۔ اور تھیلے میں فائلیں ڈال کر صنم الیکٹرونکس کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر کھڑے ملازم نے اس کے لئے دروازہ کھول دیا اور عارف کاؤنٹر پر چلا آیا۔

"ارے عارف تم..... یار بڑے دنوں بعد شکل دکھائی ہے۔" بولنے والے کا لہجہ مسرت سے بھرپور تھا۔

"کیا کروں دوست! زمانہ مہنگائی کا ہے۔ دفتر میں بھی اوور ٹائم لگاتا ہوں۔ پھر گھر کو بھی وقت دینا ہوتا ہے۔ بس فارغ وقت ہی نہیں ملتا۔ آج دفتر سے واپسی پر ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ تم سے ہی مل لیا جائے۔" عارف کہتا چلا گیا۔ اور پھر کاؤنٹر کے ایک طرف چوکور ساتختہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر ایک پلاسٹک کا اسٹول گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"اور سناؤ اقبال کیا مصروفیات ہیں۔" عارف نے روایتی انداز میں بات شروع کی۔ لیکن اقبال کی نظریں کپڑے کے تھیلے پر جمی ہوئی تھی۔

"تو کیا یہ ریڈیو تم نے خرید لیا؟" اقبال نے سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے خرید لیا..... کیا؟..... بھائی یہ میری فائلیں ہیں!"

"ابھی ابھی ایک آدمی میرے پاس ریڈیو بیچنے آیا تھا۔ وہ ریڈیو اسی تھیلے میں تھا۔"

"کیا توقیر یہاں ریڈیو بیچنے آیا تھا..... لیکن اس نے تو یہاں سے وہ ریڈیو خریدا ہے۔" عارف نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ ریڈیو بیچنے آیا تھا۔ لیکن میں نے خریدنے سے انکار کر دیا۔ ویسے تم اسے کیسے جانتے ہو؟" اقبال نے عارف کو کریدنے کی غرض سے کہا۔

"وہ میرا دوست ہے۔ لیکن غریب ہے۔ اب میں ساری بات سمجھ گیا ہوں۔ اسے ضرور کوئی مجبوری آپڑی ہوگی۔ وہ بہت خوددار ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اسے پسند نہیں۔" عارف کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔

"یار پھر تو مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے اپنے بیٹے کی داخلہ فیس ادا کرنی ہے۔ لیکن میں نے اس کو غلط سمجھا اور تلخی سے پیش آیا۔" اقبال نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ پھر ان کے درمیان کچھ دیر اسی موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ آدھے گھنٹے بعد عارف رخصت ہو گیا۔ لیکن اقبال اپنے دل پر بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے توقیر کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس نے کہا تھا۔ "اگر میرے بچے کی فیس جمع نہ ہو سکی تو اسے اسکول سے نکال دیا جائے گا۔"

اقبال اٹھ کر کاؤنٹر کے پیچھے ٹہلنے لگا۔ رات

ہونے کی وجہ سے دکان پر بہت رش ہو گیا تھا۔ ملازم لڑکے گاہکوں کی طرف متوجہ تھے لیکن اقبال..... وہ اپنے رویئے پر بہت نادم تھا۔ لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ لیکن بازار میں بھیڑ کم نہیں ہوئی تھی۔ اتنے میں میلے لباس میں ملبوس ایک آدمی صنم الیکٹرونکس میں داخل ہوا۔ اس نے چمڑے کا دستی بیگ پکڑ رکھا تھا۔ دکان میں داخل ہو کر اس نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا اور کاؤنٹر کی طرف قدم اٹھا دیئے۔ اقبال اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ آدمی اقبال کو متوجہ پا کر اس کے پاس آگیا۔ اور کہنے لگا۔

"میں بہت ضرورت مند ہوں۔ یہ ٹیپ ریکارڈر خرید لیجئے..... وہ بولتا رہا۔ اقبال سنتا رہا اس کے چہرے پر رونق دوڑنے لگی۔ اس کے غلط رویئے کا مداوا ہونے والا تھا۔ اس نے سرسری انداز میں ٹیپ ریکارڈر کا جائزہ لیا اور پھر پانچ سو کا نوٹ اس آدمی کو پکڑا دیا۔ اس آدمی نے چمکتی آنکھوں سے اقبال اور صنم الیکٹرونکس کی عالیشان دکان کو دیکھا اور بیرونی دروازے کی طرف قدم اٹھا دیئے۔ باہر آکر اس نے ایک طائرانہ نظر دکان پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں کی چمک گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر سگریٹ سلگایا۔ اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اقبال خود کو بہت سکون محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کسی ضرورت مند کی مدد کی تھی۔ صنم الیکٹرونکس کا نیون سائن اسی طرح چمک رہا تھا۔ عمارت پر نصب روشنیوں نے تاریکی کا احساس مٹا دیا تھا۔ ٹھیک بارہ بجے ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ سونے والے ہڑ بڑا کر اٹھنے لگے۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ اور صنم الیکٹرونکس کی عالیشان عمارت ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ روشنیاں بجھ چکی تھی۔ اب ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

متوازن غذا
صحت کی ضامن

ماہرین غذائیت، غذاؤں کو درج ذیل چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں

- سبزیاں، پھل اور فروٹ
- اناج، چاول، گندم اور دالیں وغیرہ
- دودھ، مکھن، گھی، پنیر اور دہی وغیرہ
- گوشت، انڈے، مرغی اور مچھلی وغیرہ

اگر آپ نے دن بھر کی غذاؤں میں ان چاروں حصوں سے کچھ نہ کچھ چکھ لیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے متوازن غذا کھالی اور آپ کے جسم کو مطلوبہ توانائی میسر آگئی۔

اشتہار برائے ترغیب حفظان صحت و تندرستی اطفال - آنکھ مچولی

غریب لڑکا

ناصر علی منصوری

سناؤں تمہیں ایک قصّہ عجیب
کہ تھا ایک لڑکا بہت ہی غریب

محلّہ کے سب لوگ خوش حال تھے
فقط اس کے والد ہی کنگال تھے

کوئی اُس کو خاطر میں لاتا نہ تھا
کوئی پاس اپنے بٹھاتا نہ تھا

سمجھتے تھے سب اس کو ناحق ذلیل
مگر پاس اُن کے نہ کچھ تھی دلیل

غریبی کا لیکن اسے غم نہ تھا
حسد سے نہ تھا دور کا واسطہ

شکایت نہ تھی اس کو تقدیر سے
اسے کام تھا صرف تدبیر سے

کسی سے کبھی وہ جھگڑتا نہ تھا
کبھی اپنے چھوٹوں سے لڑتا نہ تھا

وہ جاتا تھا اسکول بھی شوق سے
اسے پیار کرتے تھے گھر کے بڑے

جو پکتا تھا گھر میں وہ کھاتا تھا وہ
بُری بات لب پہ نہ لاتا تھا وہ

کسی سے اسے کچھ شکایت نہ تھی
کوئی یاد جھوٹی حکایت نہ تھی

وہ پڑھ لکھ کے جب ہو گیا کامیاب
محلے میں اس کا نہ تھا پھر جواب

رویّہ ہر اک کا بدلنے لگا
ہر اک اس کے کہنے پہ چلنے لگا

جو بننا ہے تم کو بڑا آدمی
گزارو اُسی کی طرح زندگی

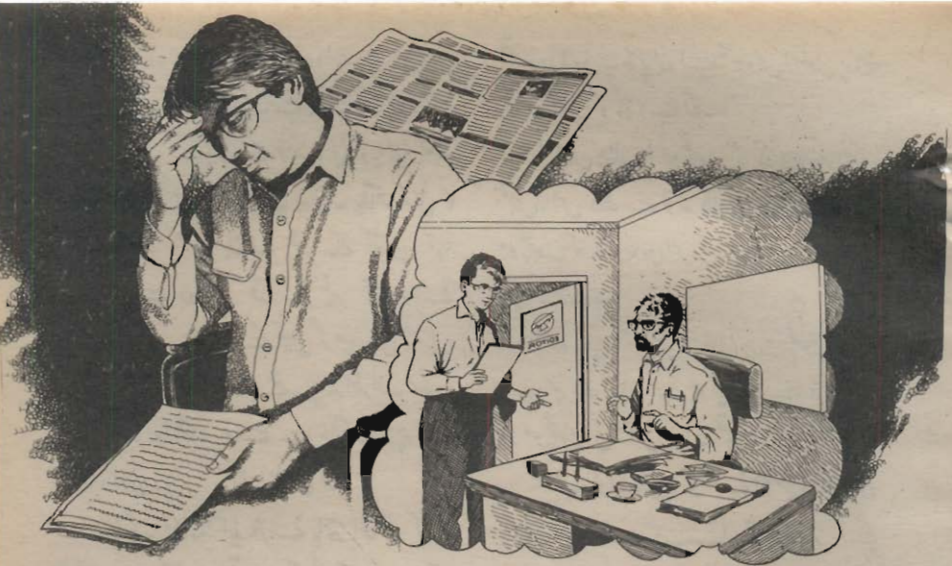

ایڈیٹر کی میز پر

سیما صدیقی

مصنف "ماہنامہ قومی آواز" کے دفتر میں داخل ہوا۔

"جی! مجھے "قومی آواز" کے ایڈیٹر سے ملنا ہے۔

"ضرور ملئے!" ایڈیٹر کے لہجے میں شائستگی تھی جس میں ہلکی سی بے نیازی بھی تھی۔

"جی! میں گزشتہ دس سال سے آپ کا "ماہنامہ قومی آواز" پڑھ رہا ہوں اور....."

"جناب! بڑی خوشی ہوئی یہ سن کر..... کیونکہ "قومی آواز" کا عرصۂ اشاعت محض سات سال ہے۔" ایڈیٹر نے بات کاٹتے ہوئے متانت سے کہا۔

مصنف کسمسا کر بولا "میرا مطلب ہے کافی عرصے سے..... دراصل میں نے ایک کہانی لکھی ہے اور....."

"ٹھیک ہے! چھوڑ جائیں، اگر قابلِ اشاعت ہوئی تو تین ماہ کے اندر شائع ہو جائے گی۔"

مصنف کچھ متامل نظر آیا، پھر قدرے لجاجت سے کہا "جناب! بہت ہی مختصر سی کہانی ہے، اگر آپ ابھی سماعت فرمالیں تو..... میں زیادہ وقت نہیں لوں گا آپ کا"

"ہوں!" ایڈیٹر نے انگلی سے چشمہ ناک کی پھننگ

پہ کھسکایا اور مصنف کا بغور جائزہ لیا۔ پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا "ٹھیک ہے جناب سنایئے!"

مصنف نے چند لمحے توقف کیا گویا لمبی گفتگو کے لئے سانسیں اکٹھا کر رہا ہوں۔ بالآخر کہانی کا آغاز کیا۔ "یہ بلڈنگ شہر کے گنجان آباد علاقے سے دور..... قدرے غیر آباد علاقے میں واقع تھی۔ بلڈنگ کے مکین گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے مری گئے ہوئے تھے۔ چہار اطراف مہیب سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ سامنے سے بلڈنگ کا چوکیدار آتا دکھائی دیا..... یہ ایک پٹھان تھا۔"

"ایک منٹ!" ایڈیٹر نے ہاتھ اٹھا کر کہا' "جناب اس جملے سے تعصب کی بو آرہی ہے، کیا آپ کو نہیں آرہی ہے؟ اس سے لسانی تفرقہ پھوٹ سکتا ہے۔ بھلا یہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ ایک پٹھان تھا۔ یہ "قومی آواز" ہے جس کا پیغام یہی ہے کہ ہم پہلے انسان ہیں، پھر مسلمان اور پھر پاکستانی اور بس!"

"جی! بخدا میرا یہ مقصد نہ تھا بلکہ ایسا تو شائبہ تک میرے ذہن میں نہ تھا۔" مصنف گڑبڑا گیا۔

"اچھا..... اچھا ٹھیک ہے آپ اس فقرے کو کاٹ کر یوں لکھئے۔

"سامنے سے بلڈنگ کا چوکیدار آتا دکھائی دیا جو ایک انسان تھا۔ سندھی تھا یا پٹھان تھا، ہمیں اس سے کیا..... اب آگے چلئے!"

"رات کے دس بجے اس کی ڈیوٹی شروع ہوتی تھی، وہ ڈیوٹی پہ پہنچا اور اپنے مخصوص اسٹول پر بیٹھ کر مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔"

"نہیں جناب! مونچھوں کو تاؤ دینا کچھ ٹھیک نہیں، اس جملے سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے گویا..... مونچھوں کو تاؤ دینا ہی اس کی ڈیوٹی ہو....." آپ یوں لکھئے کہ۔

"وہ اپنے مخصوص اسٹول پر مونچھوں کو تاؤ دیئے بغیر بیٹھ گیا۔ اسے چوکیداری سے غرض تھی اور مونچھوں کی مطلق پروانہ تھی۔"

مصنف کو ایڈیٹر پہ تاؤ آنے لگا مگر بمشکل خود پر قابو پایا اور کسمساتے ہوئے آگے بڑھا۔

"کچھ ہی دیر بعد چوکیدار اونگھنے لگا۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں نیند کے سرخ ڈورے صاف دکھائی دے رہے تھے۔"

"خوب! بہت خوب! چوکیدار اونگھنے لگا۔ اس سے آپ چوکیداروں کو کیا سبق دینا چاہ رہے ہیں؟ یعنی کہ فرائض سے غفلت۔ چوکیداری تو نام ہی جاگتے رہنے کا ہے۔ "جاگتے رہو" کی آواز لگا کر نہ خود سوتا ہے نہ دوسروں کو سونے دیتا ہے۔ آپ لکھئے کہ۔

"چوکیدار چوکس بیٹھا تھا....." واہ کیا جملہ ہے گویا انگوٹھی میں نگینہ!" ایڈیٹر نے خود ہی اپنے جملے کو سراہنا شروع کر دیا۔ مصنف نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا..... "مگر جناب! اگر چوکیدار کو چوکس بیٹھا دوں گا، تو چوری یا ڈاکے کی واردات

کیسے ہوگی؟"

"ہائیں! گویا آپ اس گمان میں ہیں جب ڈاکو حضرات بینک میں ڈاکا ڈالنے پہنچتے ہیں، اس وقت بینک کا جملہ اسٹاف بمعہ گارڈ بیٹھا اونگھ رہا ہوتا ہے یا ادھ کھلی آنکھوں سے اپنے کھاتہ داروں کو نمٹا رہا ہوتا ہے۔ نہیں جناب! بینکار ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھتے ہیں پھر بھی ڈاکا پڑ جاتا ہے۔ مختصریہ کہ چوری ڈاکے کے لئے لوگوں کا غافل ہونا ضروری نہیں۔ اور ہاں! رات کے دس بجے تو سڑک کے ادھ کھلے مین ہول بھی نظر نہیں آتے اور لوگ غڑاپ ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ آپ کو چوکیدار کی آدھ کھلی آنکھوں کے سرخ ڈورے کیسے نظر آگئے؟ اگر ڈالنا ہی ہے تو چوکیدار کی آنکھوں میں سرمہ ڈالیں اس سے وہ مزید چوکس نظر آئے گا۔ ہوں تو جملہ کچھ یوں بنا.....

"کچھ دیر بعد چوکیدار چوکس ہو کر بیٹھ گیا، اس کی کھلی کھلی آنکھوں کا سرمہ رات کی تاریکی میں مدغم ہو گیا۔ آگے چلئے.....!"

"اچانک مشرقی سمت جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ ایک سایہ اندھیرے کی چادر اوڑھے نمودار ہوا اور دبے پاؤں چلتا ہوا..... بلڈنگ کی عقبی دیوار کی سمت کھسکنے لگا۔"

"ایک منٹ جناب!" مشرق کی سمت جھاڑیوں میں سرسراہٹ!" یہ کیا لکھ دیا آپ نے؟ ہمسایہ ملک سے ہمارے تعلقات پہلے ہی کشیدہ ہیں جو رہے سہے ہیں وہ آپ ختم کرانے کے درپے ہیں۔"

"جی! میں کچھ سمجھا نہیں؟" مصنف نے پریشان خیالی کا مظاہرہ کیا۔

"گویا آپ کو معلوم ہی نہیں کہ پاکستان کے مشرق میں بھارت واقع ہے۔ جغرافیائی بنیادوں پر لوگ اسے علامت کے طور پر لے سکتے ہیں، کہ بھارتی سرحد سے ایک چور یا تخریب کار جھاڑیاں پھلانگتا پاکستان آگیا۔"

"جی!" مصنف دنگ رہ گیا۔ "مگر جناب یہ علامت تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ بخدا یہ علامتی کہانی نہیں ہے اور نہ ہی جغرافیہ سے اس کا کوئی علاقہ ہے۔" اب مصنف تقریباً رو دینے کو تھا۔

"ٹھیک ہے جناب! تو آپ اس کو واضح طور پر اس طرح لکھئے۔

"اچانک مشرقی سمت کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی مگر اس سرسراہٹ کا پڑوسی ملک سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک چور دندناتا ہوا جھاڑیوں سے یوں برآمد ہوا جیسے شیر اپنی کچھار سے..... اس نے چوکیدار کے سر پر کلاشن کوف کا بٹ مارا۔ ایک عدد ہوائی فائر کیا۔ اس طرح اسے دبے پاؤں عقبی دیوار کی سمت کھسکنے کی ضرورت نہ پڑی بلکہ عقبی دیوار کی سمت زخمی چوکیدار کھسک گیا، اور چور مرکزی دروازے کو "ماسٹر کی" سے کھول کر اندر چلا گیا۔ اب آگے چلیں!"

ایک منٹ جناب! ذرا توقف فرمائیں، میں یہاں "ہوائی فائر" کے ردِّ عمل کے طور پر ایک جملہ لکھ دوں۔" مصنف نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

"کیا لکھا؟" ایڈیٹر کے لہجے میں گہری متانت تھی۔

"ہوائی فائر کے ساتھ ہی سامنے والی بلڈنگ سے ایک عورت کی چیخ ہوا کے دوش پہ لہرائی اور دور کہیں کتے نے بھونکنا شروع کر دیا....."

"ہائیں! کیا آپ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ کوئی خاتون بالکل تیار بیٹھی تھی کہ جونہی چور فائر کرے وہ اپنی چیخ کو ہوا کے دوش پہ لہرائے؟ اور کیا آپ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ذرا سی فائرنگ سے ہماری خواتین کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور وہ بدحواس ہو کر چیخنے لگتی ہیں؟ آپ یہاں لکھئے کہ.....

"ہوائی فائر کے ساتھ ہی سامنے والی بلڈنگ سے ایک خاتون کے کھل کھلا کر ہنسنے کی آواز ابھری!"

"ایں! مگر جناب یہاں کھل کھلا کر ہنسنے کا کیا موقع تھا؟" مصنف نے جز بز ہو کر استفسار کیا۔

"جناب! اس سے معلوم ہو گا کہ ہماری خواتین میں..... ہر آفت کو ہنس کر سہہ جانے کا حوصلہ ہے۔ رات کے دس بجے خاتون محض مسکراتیں تو بجھائی نہ دیتا مجبوراً اسے کھل کھلانا پڑا۔ اور ہاں یہ آپ نے منظر نامے میں خاتون کے چیخنے اور کتے کے بھونکنے کو بلاوجہ "مکس اپ" کر دیا ہے۔ اس پر "قومی آواز" پڑھنے والی خواتین برا مان سکتی ہیں، ان میں اضطراب بلکہ اشتعال پھیل سکتا ہے، آپ واضح طور پر لکھیں کہ.....

"خاتون کے کھل کھلا کر ہنسنے کی آواز ابھری اور اس موقع پر "کتے" نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ ہاں آگے چلئے!" مصنف نے منہ بنایا اور کہانی کو آگے بڑھایا.....

چوکیدار نے بھانپ لیا کہ بلڈنگ میں کوئی گھس چکا ہے چنانچہ وہ فوری طور پر بھاگتا ہوا قریبی تھانے پہنچا اور پولیس موبائل وین کے ہمراہ جائے واردات پہ پہنچ گیا۔ پولیس مین گاڑی سے اترا۔ مرکزی دروازے پر کھڑے ہو کر چند ثانئے کچھ سوچا اور پھر....."

"ایک..... منٹ!" ایڈیٹر نے ہاتھ اٹھا کر کہا" کیا آپ مافوق الفطرت باتوں پر بھی یقین رکھتے ہیں؟ آخر یہ کراچی کا کونسا تھانہ تھا اور وہ کونسا جانباز سپاہی تھا جو چوکیدار کے بلاوے پر کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا۔ نہیں برخوردار نہیں! آپ کے تخیلات اپنی جگہ! لیکن ہم اپنے رسالے میں ایسے غیر حقیقی اور غیر منطقی مناظر نہیں دکھا سکتے۔ آپ پولیس والے کو نہ صرف عین موقع واردات پر لاتے ہیں بلکہ اسے کچھ "سوچتے" ہوئے بھی دکھاتے ہیں۔ دونوں ہی باتیں حقیقت کے منافی ہیں۔ اس پر آپ سے پوچھ گچھ ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے اسے یوں لکھیں۔

"پولیس والے نے دروازے پر کھڑے ہو کر

کچھ نہ سوچا (کیونکہ سوچنے سمجھنے کا کام چور کا تھا) اور بے دھڑک اندر گھستا چلا گیا دراصل راستے میں چور وائرلیس پر اسے مطلع کر چکا تھا کہ وہ تقریباً فرار ہو چکا ہے۔"

"لیکن جناب! اس طرح تو چور "ہیرو" بن جائے گا اور پولیس اور چوکیدار کا کردار دب کر رہ جائے گا۔ جبکہ میری کہانی کا تو کلائمکس ہی یہ ہے کہ چوکیدار جان کی بازی لگا کر پولیس کی مدد سے چور کو گرفتار کروا دیتا ہے۔ پھر بلڈنگ کے مکین اسے انعامات سے نوازتے ہیں۔"

"چہ خوب! ابتدا میں آپ جسے سوتا ہوا دکھاتے ہیں، اختتام پر انعام سے نواز رہے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں "جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے" (پنجابی والا کھوتا نہیں اردو والا) اور آپ اسے انعامات دلوا رہے ہیں۔ جبکہ بہادری کا انعام حاصل کرنے کے لئے گارڈ کا فوت شدہ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ جو اس قسم کی بہادری دکھاتا ہے اس کا منطقی انجام یہی ہوتا ہے۔"

"دیکھیں محترم! آپ میرے ہیرو کے کردار کو غیر ارادی طور پر مسخ کر رہے ہیں۔ اس کا کردار دبا رہے ہیں اور چور کا کردار ابھار رہے ہیں۔" مصنف نے کمزور سی آواز میں احتجاج کیا۔

"لیکن جناب! اگر ہم ایسی ڈھیلی ڈھالی کہانیاں چھاپنے لگیں تو لوگ "قومی آواز" کے ساتھ ہمارا بھی گلا دبا دیں، بہتر ہے کہ ہم آپ کے ہیرو کا کردار دبا دیں۔ (بلکہ آپ کی کہانی کو ہی کہیں دبا دیں!) ویسے بھی آپ کی کہانی میں آمد جلد بہت ہے، کہانی کے آغاز میں چوکیدار آتا ہے، درمیان میں چور آتا ہے اور آخر میں پولیس! آپ یوں کیوں نہیں دکھاتے کہ "چور پولیس کی ہمراہی میں بلڈنگ میں داخل ہوا۔" ایڈیٹر نے تھوڑی کھجاتے ہوئے آئیڈیا پیش کیا۔ مصنف دم بخود رہ گیا۔ اس کا چہرہ لمبا ہو گیا۔ ایڈیٹر نے پر خیال لہجے میں کہا "دیکھیں نا! چور بیچارا اکیلا تن تنہا..... اور خالی بھائیں بھائیں کرتی بلڈنگ، اگر پولیس والا ساتھ ہو گا تو اسے حوصلہ رہے گا..... میرا مطلب ہے دوسرا آدمی ساتھ ہو گا تو دل نہیں گھبرائے گا۔"

"لیکن پولیس اور چور کو ساتھ دکھانے سے دونوں کے گٹھ جوڑ کا تاثر ابھرے گا..... اور۔"

"جی نہیں! اس سے معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان ہم آہنگی، ملنساری اور امدادِ باہمی کا تاثر ابھرے گا، آپ منفی انداز سے نہ سوچیں۔"

"جناب! چور اور پولیس کے درمیان ملنساری دکھانے سے بہتر ہے کہ میں "پولیس" کا کردار حذف کر دوں۔" مصنف نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک! جب پولیس کو چور پکڑنا ہی نہیں تو اس کے ذکر کا فائدہ؟ بلکہ میری رائے لیں تو چور کا کردار بھی حذف کر دیں جو آپ کے ہیرو کو دبا

یہ تو آدمی ہیں

○..... فقیر سید وحیدالدین کے ایک عزیز کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا ایک دفعہ فقیر صاحب اپنے عزیز کی موٹر میں بیٹھ کر علامہ اقبال سے ملنے آئے اور پالتو کتوں کو بھی ساتھ لیتے آئے۔ خود تو علامہ صاحب کے قریب جا بیٹھے لیکن کتوں کو موٹر میں چھوڑ گئے۔

کچھ دیر بعد علامہ اقبال کی چھوٹی بیٹی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔

"ابا جان موٹر میں کتے آئے ہیں۔"

علامہ اقبال نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا.....

"نہیں بیٹی..... یہ تو آدمی ہیں۔"

(مرسلہ آصف حسین. سیالکوٹ)

سے زیادہ خوش ہوا۔ بلڈنگ کے مکین واپس آئے تو چوکیدار نے بتایا۔ "نہ مشرقی سمت جھاڑیوں سے کوئی چور آیا، نہ میں نے سر پر ہٹ کھایا، حفظِ ماتقدم کے طور پر پولیس کو بلالایا، دونوں نے خود پر بمشکل قابو پایا، اور بلڈنگ میں گھسنے کے باوجود کوئی مال نہیں اڑایا، اس پر مکین خوش ہو کر چوکیدار کو ایمانداری کا انعام دیتے ہیں (جو ڈر کے مارے چوری نہ کر سکے اسے عرفِ عام میں ایماندار کہتے ہیں۔) اس موقع پر پولیس مین کو کوئی انعام نہیں دیا جاتا کیونکہ وہ صرف چوروں ڈاکوؤں سے انعام لیتے ہیں شریفوں سے نہیں....."

"دیکھا جناب مصنف صاحب! ذرا سی نوک پلک سنوارنے، تھوڑی سی اصلاح و ترمیم اور معمولی سی قطع و برید کرنے سے آپ کی کہانی کیسی بکھر..... میرا مطلب ہے نکھر گئی۔"

کہانی کی روح قبض ہو چکی تھی۔ مگر مصنف ابھی زندہ تھا چنانچہ بولا "جناب! کیا یہ..... کہانی شائع ہو جائے گی.....؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں..... ہمیں تو اچھی کہانیوں کی تلاش رہتی ہے..... اسے آئندہ شمارے میں ہی لگا دیتے ہیں....."

"شکریہ! جناب، بہت نوازش، لیکن برائے مہربانی بطور مصنف اس پر میرا نام نہ دیجئے گا۔" مصنف سراپا درخواست گزار بن گیا اور ایڈیٹر کو ہکا بکا چھوڑ کر "قومی آواز" کے دفتر سے باہر نکل گیا۔

رہا ہے۔"

"جی!!" مصنف کراہ اٹھا۔ "مگر پھر کہانی میں بچے گا کیا؟"

"ہم! ایڈیٹر نے پر خیال انداز میں سر ہلایا "اچھا آپ دل گرفتہ نہ ہوں۔ صرف چور کا کردار حذف کر دیں اور پولیس کو چوکیدار کے ساتھ بلڈنگ میں جاتے دکھا دیں۔ کہانی کا اختتام آپ کی منشا کے مطابق کچھ یوں ہو گا۔

"چوکیدار پولیس کی ہمراہی میں بلڈنگ میں داخل ہوا۔ دور دور تک چور کا نام و نشان نہ تھا۔ (اور ہو بھی کیسے سکتا تھا جبکہ ہم اس کا کردار حذف کر چکے ہیں۔) چوکیدار خوش ہوا۔ پولیس والا اس

یہ خدمت جناب

عمر حیات رنگو، اٹک: میری خواہش ہے کہ آنکھ مچولی کا کیمرہ میرے نام نکل آئے۔ اگر کیمرہ میرے نام نکلے تو آپ اس کیمرہ کی رقم مجھے ارسال کر دیں۔ میں اس رقم سے ایسے دس غریب طلبا کو آنکھ مچولی کا سالانہ خریدار بناؤں گا جو غربت کی وجہ سے یہ رسالہ نہیں خرید سکتے۔

○ ...... اگر کیمرہ آپ کے نام نکلا تو آپ کی نیک خواہش پوری کر دی جائے گی۔

شاہ زیب حسن ٹنڈو آدم: کیا خیال ہے انکل کیمرہ ہمارا ہی ہے ناں؟ یقین جانئے انکل اگر ہمارا کیمرہ نکل آیا تو پہلی تصویر آپ ہی کی کھینچیں گے۔ بولئے منظور؟

○ ...... اچھا تو آپ ہمیں رشوت دے رہے ہیں۔ بھئی ہم رشوت نہیں لیتے۔

محمد فیصل محسن، کراچی: آنکھ مچولی کی کہانیوں کا معیار اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ پورا رسالہ طلسمی کہانیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ "کرشمہ" کو تو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ کہانی آنکھ مچولی جیسے رسالے میں چھپ رہی ہے۔

○ ...... ایک آدھ کہانی کو پڑھ کر لگتا ہے آپ نے پورے رسالے کے بارے میں رائے قائم کرلی ہے

جمال عبد الناصر، حیدر آباد: آپ کو ہم تین بھائیوں نے پرائز آف پوزشن کی سند کے لئے اپنے تصدیق نامے ارسال کئے تھے۔ دو ماہ ہو چکے ہیں مگر آپ نے سند نہیں بھیجی۔

○ ...... پرائز آف پوزیشن لینے والوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی ہے۔ باری آنے میں تھوڑی اور دیر ہو گی۔

مقصود احمد خان، بوری خیل: اگر آپ اجازت دیں تو میں ایسی طوفانی اور دھماکہ خیز تحریریں لکھ کر بھیجوں گا کہ آپ انگلیاں منہ میں دبوچ لیں گے۔

○ ...... جناب! آپ کو اجازت ہی اجازت ہے۔ مگر خدارا ایسی کہانیاں نہ لکھئے گا کیونکہ ہمیں بھی اپنی انگلیاں بہت

عزیز ہیں۔

نوشین مختار رانا، رحیم یار خان: کیا آپ کرکٹ اسپیشل شائع نہیں کر سکتے؟

○ ..... کرکٹ اسپیشل ایک مرتبہ چھپ چکا ہے۔

آصف حسین، سیالکوٹ: آنکھ مچولی ہی بہت دیر سے ملتا ہے جس کی وجہ سے ہم کئی مقابلوں میں حصہ نہیں لے سکتے۔

○ ..... آپ اپنے ایجنٹ سے شکایت کیجئے۔

ہما جبیں، مظفر گڑھ: آپ وی آئی پی شخصیات کے خطوط فوراً شائع کر دیتے ہیں اور قارئین کے خطوط دس دس مرتبہ لکھنے کے بعد شائع ہوتے ہیں۔ آنکھ مچولی بچوں کا پہلا رسالہ ہے جس نے بوسینا پر مضمون شائع کیا۔

○ ..... لیجئے اب تو آپ کا خط بھی شائع ہو گیا۔

عبدالحمید محمد اسمٰعیل سومرو، نوشہرو: اگر مجھے کیمرہ مل گیا تو ہمارے ہاں برسات نے جو تباہی مچائی ہے اس کی تصویریں آپ کو بھیجوں گا۔

ثونیہ افضل طور، فیصل آباد: میں چوتھی جماعت سے آپ کا رسالہ پڑھ رہی ہوں اور اب تھرڈ ڈائز میں پہنچ چکی ہوں میں نے پورے فیصل آباد میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے سلور میڈل حاصل کیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے بہترین طالبہ کا اعزاز بھی مل چکا ہے۔ یہ سب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے مجھے پاکستان کوئز میں شامل نہیں کیا۔

○ ..... ہمیں فخر ہے کہ آپ جیسی ذہین اور محنتی طالبہ آنکھ مچولی کی قاری ہے "پاکستان کوئز" کے نتائج کا دو مرتبہ اعلان کیا گیا اس لئے شکایت تو نہیں ہونی چاہئے۔

ناہید عنی، گوجرانوالہ: آنکھ مچولی کے اندرونی سرورق پر لکھا ہوتا ہے کہ "پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔" اس کا کیا مطلب ہے؟

○ ..... جی آپ غلط سمجھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جب کوئی تحریر آنکھ مچولی میں چھپ جائے تو پھر اسے کہیں اور نقل کرنے کے لئے ادارہ آنکھ مچولی کی اجازت ضروری ہے۔ یہ طریقہ دنیا بھر میں رائج ہے۔

محمد شفیق، لاہور: ستمبر کا شمارہ دیر سے ملا مگر پڑھتے ہی ساری ناراضگی دور ہو گئی۔ سرورق سمیت سبھی تحریریں اچھی تھیں۔

شعیب عباسی کاظمی، راولپنڈی کینٹ: آنکھ مچولی کا ویڈیو میگزین بے حد اچھا لگا۔ یہ ایک بے حد معیار کا ویڈیو میگزین ہے۔

سیدہ عاصمہ شبیر، گجرات: اسلام نمبر نکالئے۔

○ ..... انشاء اللہ۔

غزالہ رمضان، کراچی: آپ سیلاب زدگان کی مدد کے لئے کوئی اسکیم تیار کیجئے تاکہ ہم سب بچے آپ کو اس فنڈ میں پیسے بھجوا سکیں۔

○ ..... سیلاب سے متاثر بھائیوں کے لئے حکومت اور دوسری تنظیمیں امداد وصول کر رہی ہیں، آپ وہاں امدادی رقم جمع کرا سکتے ہیں۔

محمد عابد گل، گھلابٹ ٹاؤن: اکتوبر کے شمارے میں "کام کرو، کاہل نہ بنو" کی تصویری کہانی بہت پسند آئی۔

عبدالرزاق، ملتان: اکتوبر کا سرورق دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور کہانیاں پڑھی تو ماننا پڑا کہ واقعی آنکھ مچولی لاجواب رسالہ ہے۔ خاصی طور پر "فتح" "کتا اور چور" اور "ہم سب نافرمان ہیں" کی بات ہی اور تھی۔

خرم شیرازی، بھکر: کشمیر نمبر میں میری تحریر "ایک اور مجاہد" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی لیکن اب تک اس کا معاوضہ نہیں ملا ہے جو ناانصافی ہے۔

○ ..... آپ کو معاوضہ یقیناً ملے گا۔ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ کہانی چھپ گئی اور ہم نے معاوضہ بھی ارسال کر دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ کہانی نقل شدہ تھی۔ اس لئے اب ہم ذرا انتظار کے بعد معاوضہ بھیجتے ہیں۔

اورنگ زیب زید، آزاد کشمیر: اکتوبر کا شمارہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ اس ماہ کی بہترین تحریریں یہ تھیں۔ "سنڈریلا" "عطار" "صفر کی واپسی" "لالی" "ہم

ایک دُکھ بھرا خط

محترم ...... السلام علیکم

اکتوبر ۹۲ کا شمارہ آنکھ مچولی اس وقت میرے سامنے ہے، اور میری آنکھ میں آنسو بھر آئے ہیں۔

کالم "بہ خدمت جناب" میں راحت صلاح الدین کراچی کا خط شائع ہوا ہے جنہوں نے اسما پاشا سے دوستی کی خواہش ظاہر کی ہے۔

ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ ہم کیسے اپنا یہ دُکھ آپ سب تک پہنچائیں۔ میری پیاری گڑیا اسما پاشا جو کہ میری نواسی تھی، ۱۰ جون ۹۲ء بدھ کو ہم سب کو چھوڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملی ہے۔ آج راحت صلاح الدین صاحبہ کا خط دیکھ کر دل غم سے بھر گیا ہے۔

جب راحت صلاح الدین صاحبہ کی کتاب کے شائع ہونے کی خبر آنکھ مچولی میں آئی تھی تو پیاری گڑیا اسما پاشا نے اس کو خریدنے کے لئے مجھے کئی مرتبہ بک اسٹال پر بھیجا۔ مگر ہر بار یہی معلوم ہوا کہ ابھی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔

شائد کتاب بک اسٹال پر آئی ہی نہیں کیونکہ مجھے نہیں مل سکی۔ اسما پاشا آنکھ مچولی بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ اور یہ میری ذمہ داری تھی کہ اسے یہ رسالہ ہم لا کر دیں۔ اپنی عمر کی ۱۲ بہاریں دیکھ کر وہ چلی گئی۔ اپنے والدین کی اسما پاشا اکلوتی بچی تھی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ غم ہم سب کے لئے کتنا بڑا ہے۔ لیکن ملکِ حقیقی کی مصلحت وہی جانتا ہے۔ اسما پاشا کی جدائی کے بعد ہم نے چاہا تھا کہ آپ کو خط لکھ کر اس سانحہ کی اطلاع دیں۔

لیکن دل دماغ بہت منتشر رہا اور ہے۔ مگر آج راحت صلاح الدین صاحبہ کا خط پڑھ کر دل بے چین ہو گیا کہ دوستی کا بڑھا ہوا ہاتھ منوں مٹی کے نیچے جا چکا ہے۔ آپ سب ہمارے لئے دعا کریں کہ اللہ پاک پیاری گڑیا اسما پاشا کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ آمین۔

ناچیز

بلقیس محمودہ خاتون

۱۱۹ اشرف آباد، عالمگیر روڈ، کراچی

○ ...... آنکھ مچولی میں کچھ عرصہ پہلے راحت صلاح الدین کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا تو ہمیں بے شمار خطوط موصول ہوئے تھے۔ ان ہی میں ایک خط اسما پاشا کا بھی تھا اسما نے راحت صلاح الدین سے دوستی کی خواہش ظاہر کی تھی۔ راحت صلاح الدین سے اس خط کا جواب دینے میں دیر ہو گئی اور اسما اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اسما بہت پیاری بچی تھی اس کا دل انسانی ہمدردی سے بھرا ہوا تھا۔ ہمیں اسما کی موت کا بہت دُکھ ہے اور ہم ان کے گھر والوں کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

سب نافرمان ہیں" جناب عبدالقادر کی نظم وغیرہ۔ قلم قتلے میں "زمین خطرے میں ہے" اور کہانی "مجھے تم پر فخر ہے" پسند آئی۔

رستم خان، گڑھی سرفراز، سرحد۔ مجھے کہانی لکھنے کا طریقہ نہیں آتا۔ آنکھ مچولی والے مجھے مشورہ دیں میں کہانی کیسے لکھوں؟

○ ...... ایک کاغذ اور قلم لیجئے اور کہانی لکھ دیجئے۔ لیکن اس سے پہلے خوب ساری کہانیاں بھی تو پڑھیے۔

حافظ خالد محمود، صادق آباد۔ اکتوبر میں "سومنات کی دہلیز" مس فرحین کی "آپا ثمین" شگفتہ شمیم کی کہانی "سنگدل" محسن خان کا ڈرامہ "کتا اور چور" بہت پسند آئے۔ سنگدل اور سومنات کی دہلیز میں صفحات ادھر ادھر لگے ہوئے تھے۔

نوید ظفر کیانی، راولپنڈی: پیارے بھائی جان، آج

دنیا بھر میں شہروں کی فضا زہریلی ہو چکی ہے موت چپکے چپکے ہماری رگوں میں اتر رہی ہے۔ ضرورت اس کے خلاف جہاد کرنے کی ہے۔

○ ..... جی ہاں ماحول کو صاف ستھرا رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

احسن فاروق، ٹوبہ ٹیک سنگھ: آپ خلوص بھرے خط پڑھے بغیر ردی کے ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ رسالہ آپ سب کا تو ہے۔

○ ..... پیارے بھائی! آنکھ مچولی کے دفتر میں آنے والا ہر خط پڑھا جاتا ہے۔ چونکہ ہر خط کا جواب دینا ممکن نہیں ہوتا اور نہ اسے چھاپا جا سکتا ہے اس لئے آپ لوگوں کو یہ شکایت ہوتی ہے۔

عافیہ سعید سحر (؟): انکل! پلیز سارے عملے سے میرے لئے دعا کرائیے۔ آج میرا ریاضی کا پرچہ ہے۔

○ ..... آپ نے اپنے شہر کا نام تو لکھا ہی نہیں۔ دعا کا اثر پہنچے گا کیسے۔

عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ: آنکھ مچولی کا معیار اب بہت بڑھ گیا ہے۔ ہر دفعہ اس میں لطیفے نئے ہوتے ہیں۔ کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں۔ میں آپ کو کوئی مکھن نہیں لگا رہا ہوں۔

○ ..... بھئی مکھن مہنگا ہو گیا ہے اس کے تو لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خضر عباسی، ملتان: میں ایک جرمن لوک کہانی بھیجنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اسے شائع کر دیں گے۔

○ ..... اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔

رعنا ظہیر، کراچی: انکل آپ نے اگست کے شمارے میں برمودا ٹرائینگل کے بارے میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ برمودا ٹرائینگل کے متعلق ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک مشہور جادوگر ڈیوڈ کوپر فیلڈ نے برمودا سے کئی سو سال پرانا پانی کا جہاز نکالا تھا اس میں سے سونا بھی نکلا تھا لیکن وہ جہاز تھوڑی دیر میں جل اٹھا تھا۔ اس کارروائی کو ہیلی کاپٹر سے کیمروں میں محفوظ بھی کیا گیا تھا۔ لیکن ڈیوڈ بھی برمودا ٹرائینگل کا راز نہیں جان سکا تھا۔ ڈیوڈ کوپر وہ جادوگر ہے جس نے مجسمۂ آزادی کو غائب کر دیا تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی اس جادوگر کا کیٹ بیسٹ آف میجک دیکھیں اور اس کے بارے میں مضمون شائع کریں۔

○ ..... اگر آپ نے یہ کیسٹ دیکھا ہے تو کچھ آپ ہی اس بارے میں مضمون لکھ دیجئے۔

محمد شریف ظفر، گنگن پور: اکتوبر کا اداریہ بہت پسند آیا۔ واقعی عزت ان ہی کو ملتی ہے جو دوسروں کی عزت کرتے ہیں۔

حافظ محمد معظم اعزاز، سمیرا جبیں (؟): اکتوبر کا شمارہ پھر بازی لے گیا۔ اتنی اچھی کہانیاں اتنی اچھی معلومات۔ دل سے یہی دعا نکلی کہ رب العزت ہمارے اس رسالے کو ہمیشہ نظر بد سے بچائے۔

○ ..... آمین ثم آمین۔

یوسف بوبی سومرو، حیدر آباد: ستمبر میں عدیل صاحب کا مضمون "تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا" نقل شدہ تھا اور شاہد صدیقی کے نام سے پہلے ہی ایک رسالے میں چھپ چکا تھا۔ عدیل صاحب نے اس مضمون کو کاٹ چھانٹ کے اپنے نام سے شائع کرا دیا۔

○ ..... اگر آپ مضمون بھیجوا دیتے تو ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی رہتی۔ اکثر ساتھی ایسی حرکت کرتے ہیں اور بعد میں پکڑے بھی جاتے ہیں۔ لیکن چور مصنفوں کو پہلے پکڑنے کا کوئی طریقہ بھی تو ہمیں نہیں معلوم۔

شاہد محمود، راولپنڈی: اکتوبر میں "سانپ رے سانپ" "ہم سب نافرمان ہیں" اور چیزوں کی کہانی" بہت پسند آئی۔

ساجدہ ترین، مستونگ: آنکھ مچولی کو ہم سب گھر والے شوق سے پڑھتے ہیں۔ میرے چار سالہ بھائی طارق کو اس مرتبہ تصویری کہانی "کام کرو کاہل نہ بنو" بہت اچھی لگی۔

ہم سب ایک وطن کے باسی

محمد افضل سراج

ہم سب ایک وطن کے باسی
سندھ بلوچستان بھی اپنا
سرحد اور پنجاب بھی اپنا
اک رستہ اک منزل اپنی
ایک ہے جب ہر خواب بھی اپنا
پھر کس بات پہ ہے ناچاقی
ہم سب ایک وطن کے باسی

ہم سب اِک دُوجے کے ساتھی
بانہوں میں ہم بانہیں لے کر
ساتھ ملائیں یوں قدموں کو
پھر نہ علیحدہ ہونے پائیں
مل کر دور کریں خطروں کو
کچھ مت سوچیں ہم پھر ذاتی
ہم سب اِک دُوجے کے ساتھی

ہم سب ایک تو ہم سب باقی
ہم سب لوگ برابر ہیں جب
آزادی بھی سب کا حق ہے
پھر کیوں برتیں جانبداری
خوشحالی بھی سب کا حق ہے
ورنہ ہم سب کی بربادی
ہم سب ایک تو ہم سب باقی

بکرا بیتی

عنبرین آمنہ صدیقی

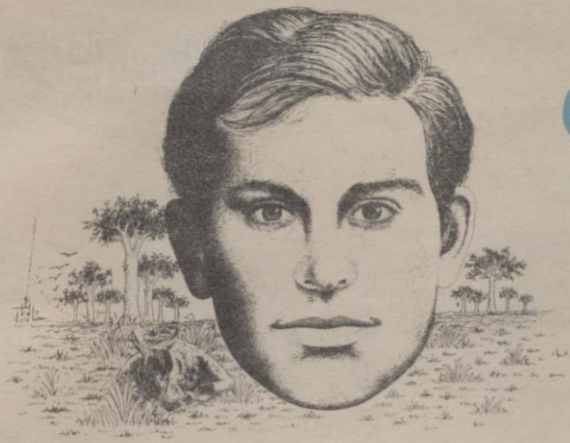

ایک بکرے کی کہانی
خود اس کی زبانی

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس جگہ آنکھ کھولی، البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ ایک ہری بھری جگہ تھی جہاں میں اور میرے بہت سے دوسرے رشتہ دار رہتے تھے۔ ہمارا مالک ایک غریب چرواہا تھا۔ جس کی گزر اوقات صرف ہمارے دودھ اور کھالوں پر تھی۔ میں بچپن میں بہت شرارتی واقع ہوا تھا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے لاڈلا بھی بہت تھا۔ اونچے درختوں پر چڑھنا اترنا، اور اچھل کود کرنا میرا بہترین مشغلہ تھا۔ ماں کے منع کرنے کے باوجود میں اس شغل سے باز نہ آتا۔ میرا دوست کلو بھی اکثر میرے ہمراہ ہوتا لیکن وہ اکثر چپ ہی رہا کرتا۔ کھلی ہوا اور سرسبز و شاداب فضا نے میرا قد کاٹھ خوب نکھار دیا اور یوں ایک سال کے مختصر عرصہ میں میں نے ایک طاقتور بکرے کا روپ دھار لیا۔

زندگی کی گاڑی یوں ہی گھسٹ رہی تھی۔ اگرچہ میری شرارتوں میں حد درجہ کمی واقع ہو گئی تھی لیکن کبھی کبھی اندر موجود بچپن شرارت کرنے پر مجبور کرتا اور میں اپنی مالکن کے سکھائے ہوئے کپڑے کھا جاتا۔ میری ماں مجھے بچپن میں بہادری کے قصے سنایا کرتی اور ہمیشہ یہ تلقین کرتی۔ "بیٹا پیار محبت سے رہنا، یہ دنیا بڑی ظالم شے ہے کسی کو نہیں بخشتی"، لیکن میں اپنی ماں کی باتیں وقتی طور پر سنتا اور پھر اپنے کھیل کود میں لگ جاتا۔

ایک دن صبح سویرے اٹھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ میرے دوست کلو کو رات کے پچھلے پہر ٹھنڈ لگ گئی ہے اور اس پر فالج کا اثر ہو گیا ہے۔ غلطی میرے مالک کی تھی کہ جس نے اس کو کوٹھری میں بند نہیں کیا تھا۔ جب میں..... اس کی عیادت کو گیا تو وہ سر جھکائے ایک طرف خاموشی سے بیٹھا تھا۔

"ابھی مالک آئے گا اور مجھے جلاد قصائی کے حوالے کر دے گا کیوں کہ اب میں اس کے کسی کام کا نہیں رہا۔" مجھے اپنے دوست کی باتیں سن کر انتہائی رنج ہوا اور میں نے احتجاج کی آواز بلند کرنا چاہی لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے، میں بھی خاموش ہی رہا۔ دوست کے مرنے کے بعد مجھ پر خاص توجہ دی جانے لگی۔ میرا مالک مجھے اچھے اچھے کھانے دیتا اور اپنے کمرے میں سلاتا مبادا کہ مجھے کچھ ہو جائے۔ ایک رات میں نے اپنی مالکن کو کہتے سنا کہ بقرعید قریب ہے، اس کو بیچ آؤ۔ چار پیسے ہاتھ آئیں گے تو بچوں کے کپڑوں کا بندوبست ہو جائے گا۔

دوسری صبح مالک نے مجھے خوب دانہ کھلایا۔ تیل کی مالش کی، پیروں میں گھنگھرو باندھے اور شہر کی جانب لے کر چل پڑا۔ راستے میں میرے ہمجولی مجھے حیرت سے تکتے اور میں شان بے نیازی سے اپنے پیروں کو جھٹکتا آگے بڑھ جاتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کا یہ الوداعی سلام ہے۔ خیر میں شہر پہنچ گیا اور میرے مالک نے مجھے ایک بکرا فروش کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اس نے مجھے وہاں باندھ دیا جہاں مجھ جیسے کئی اور بکرے بھی بندھے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ آ جا رہے تھے اور کئی ساتھی ہم سے بچھڑ رہے تھے اور پھر...... میں بھی ایک شخص کو پسند آ گیا اور ایک نئی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ شخص مجھے گھر لے آیا۔ اس کے گھر میں بچے مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور میں بھی بچوں کے درمیان اپنے سارے غم بھول گیا......

اور یوں چاند رات آ گئی۔

بچوں نے مجھے مہندی لگائی۔ گلے میں گجرے پہنائے اور عید کی خوشی میں...... ساری تیاریاں مکمل کر کے سو گئے۔ میں صحن میں بیٹھا جگالی کرتا رہا اور اپنے ہم جنسوں کی آواز پر غور کرتا رہا جو چاروں طرف سے آ رہی تھیں۔

نئی صبح کا سورج بقرعید کی مسرتیں لے کر آیا۔ بچے تتلی کی مانند گھوم رہے تھے۔ میں بھی ان کے درمیان بڑا خوش تھا کہ اچانک ان بچوں کے ابو اپنے ہمراہ ویسا ہی جلاد لائے جیسا کہ میرے دوست کلو کے وقت آیا تھا۔ وہ جلاد لال آنکھیں نکالے چھریاں تیز کرتا میری جانب بڑھا۔ نئے مالک نے مجھ چمکارا اور مجھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ہوا قربان گاہ کی طرف لے جانے لگا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر خاموشی سے سر جھکا دیا کہ موت برحق ہے۔ آج نہیں تو کل یہ وقت تو آنا ہے، یوں بھی بکرے ماں کب تک خیر مناتی .... لیکن وہ موت جو اللہ کی راہ میں آئے، ہر کسی کے نصیب میں کہاں ہوتی ہے۔ اس دم میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت لگا۔ قصائی کے ذرا ہاتھ لگانے سے میں زمین پر لیٹ گیا۔ اور نظریں آسمان پر گاڑ دیں میرا دل ہر دھڑکن پر کہہ رہا تھا۔

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْک

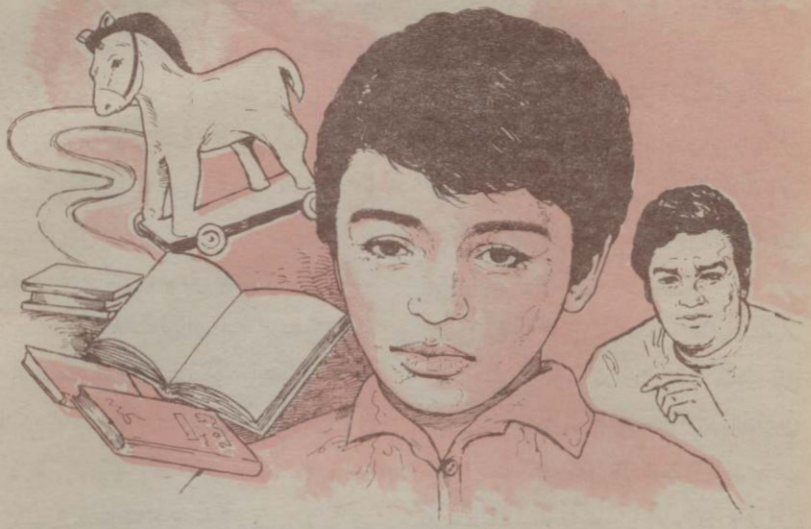

ابّو نہیں سمجھتے

منیر احمد راشد

"یہ گھوڑا دو سال سے میرے پاس ہے۔"

ننھے عمیر نے کارنس پر رکھے ہوئے پلاسٹک کے بڑے سے گھوڑے کو گھورتے ہوئے سوچا۔ جب وہ پہلی جماعت میں اوّل آیا تھا تو ابو نے اسے یہ انعام کے طور پر دیا تھا۔ کتنا اچھا تھا اس وقت..... سفید، دودھ جیسا..... چار موٹے موٹے اور مضبوط سرخ پہیے..... پیٹھ پر سنہری کاٹھی ..... کانوں کی جگہ سرخ رنگ کا دستہ، جسے پکڑ کر وہ سمجھتا تھا کہ گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں ہے۔ پھر اپنے ہی پیروں کے زور سے اسے خوب دوڑاتا ..... کتنا مزا آتا تھا..... اور جس دن اقلیم بھائی کی دکان کے سامنے والی سڑک کی ڈھلوان پر بہت تیز گھوڑا دوڑایا تھا تو بس مزا ہی آگیا تھا۔

گھوڑے پر نظریں جمائے عمیر بیتے دنوں کی یاد میں کھویا ہوا تھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ کتابیں اس کے سامنے کھلی پڑی تھیں مگر اس کا دھیان کتابوں کی طرف نہیں تھا بلکہ اس کے ذہن میں وسیم کے کھلونے سمائے ہوئے تھے۔ ہاتھی، گھوڑے، سیل سے چلنے والی کار، سارجنٹ والی موٹر سائیکل،

ریموٹ کنٹرول ہوائی جہاز، پاکٹ ویڈیو گیم اور نہ جانے کیا کیا بھرا پڑا تھا اس کی الماری میں۔ کبھی کبھار عمیر، وسیم کے گھر جاتا تو ان کھلونوں کو دیکھ کر اسے شدت سے اس بات کا احساس ہوتا کہ اس کے پاس تو کوئی بھی کھلونا نہیں ہے۔ اس نے کئی بار ابو سے فرمائش بھی کی کہ وہ اسے کھلونے لا کر دیں مگر انہوں نے کبھی اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔ بس ایک دفعہ کہہ دیا تھا "یہ گھوڑا ہے تو سہی آپ کے پاس۔ ویسے بھی اب آپ بڑے ہو گئے ہیں، تیسری کلاس میں پڑھتے ہیں، اب کھلونوں سے مت کھیلا کریں، کتابیں پڑھا کریں۔" اس دن عمیر نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھا تھا کہ وہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے چہرے کو غور سے دیکھا تھا کہ کہیں اس کی داڑھی مونچھ تو نہیں نکل آئی۔ مگر وہ ویسا ہی تھا جیسا وسیم۔ تو کیا وسیم بھی بڑا ہو گیا ہے؟..... مگر اس کے ابو تو اسے خوب کھلونے لا کر دیتے ہیں..... کیوں؟؟....." لیکن اس کا معصوم دماغ کبھی بھی اس "کیوں" کا جواب نہ دے سکا۔ اگر وہ امی یا ابو سے اس کا جواب پوچھتا تو وہ اسے ڈانٹ کر خاموش کروا دیتے اور پڑھائی میں دل لگانے کی تلقین کرتے۔

آج بھی وہ اسکول سے واپسی پر وسیم کے گھر گیا تھا اور دیر تک اس کے کھلونوں کو حسرت سے تکتا رہا تھا کیونکہ وسیم اسے اپنے کھلونوں سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ کھلونوں کے خیال سے جان نہ چھڑا سکا اور اب جبکہ رات کے کھانے کا وقت قریب تھا، وہ بظاہر اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا مگر دل و دماغ پر کھلونے سوار تھے۔ امی نے اسے رات کے کھانے کے لئے پکارا تو وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ کتابیں سمیٹ کر ایک طرف رکھیں اور کھانے کی میز پر پہنچ گیا جہاں امی جان ابو کو بتلا رہیں تھیں کہ عمیر اسکول سے آنے کے بعد سے پڑھائی میں مصروف ہے۔ ابو نے فقط گردن ہلا کر پسندیدگی کا اظہار کیا اور پھر اپنے دفتر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ابو کے اس رویئے سے عمیر کو دکھ ہوا تھا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ ابو اس کی اس کارکردگی پر اس کی تعریف کریں گے۔ خوب شاباش دیں گے اور شاید کوئی تحفہ دینے کا وعدہ بھی کریں، مگر ابو نے تو صرف گردن ہلا دی تھی۔ عمیر نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران بھی وہ ابو کے موجودہ رویئے کے بارے میں سوچتا رہا۔ ان سوچوں نے اسے اداس کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابو اس کی طرف سے اتنے لاپرواہ کیوں ہیں۔؟ "لاپرواہ نہیں شاید مطمئن ہیں۔" اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ کیونکہ پچھلی دونوں جماعتوں میں عمیر اپنے اسکول میں فرسٹ آیا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے پہاڑوں کی کتاب نکالی اور پہاڑے یاد کرنے لگا۔

"دو ایکم دو..... دو دونی چار۔" وہ ذرا

بلند آواز سے پڑھ رہا تھا تاکہ اگر امی یا ابو اس طرف آئیں تو انہیں پتہ چل جائے کہ عمیر واقعی پڑھ رہا ہے۔ بے دھیانی سے یاد کرنے کی وجہ سے اسے ایک بھی پہاڑا یاد نہیں ہو رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہیں یہ پہاڑے بھی۔" اس نے جھنجلا کر سوچا۔ "پہاڑے کیا ہیں پہاڑ ہیں ..... پہاڑ! مگر پہاڑ کیسے ہوتے ہیں؟ ..... میں نے تو کبھی نہیں دیکھے!" اس کا ذہن اب پہاڑے سے ہٹ کر پہاڑوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے سوچا۔

"وسیم بتا رہا تھا کہ پہاڑ بہت اونچے اونچے ہوتے ہیں ..... اتنی اوپر لوگ جاتے کیسے ہوں گے؟ ..... ہوائی جہاز سے جاتے ہوں گے ..... میں نے تو کبھی اصلی ہوائی جہاز بھی قریب سے نہیں دیکھا۔ بس وسیم کا ہوائی جہاز دیکھا ہے ..... کیسے اڑتا ہے ..... زوں زوں ..... ادھر بٹن دبایا۔ ادھر جہاز نیچے ..... کتنا مزا آتا ہو گا جہاز سے کھیلتے ہوئے ..... اور سارجنٹ والی موٹر سائیکل ..... وہ تو اور بھی مزے دار ہے۔ کل میں وسیم کے گھر جاؤں گا اور اس سے کہوں گا کہ آؤ چپس چپس کھیلیں۔ شاید وہ مجھے بھی اپنے ساتھ کھلا لے۔" وسیم کے کھلونوں کے بارے میں سوچتے سوچتے عمیر نیند کی نرم آغوش میں کھو گیا۔

اگلے دن وسیم کے گھر گیا تو بڑی مشکل سے وہ تھوڑی دیر عمیر کو اپنے ساتھ کھلانے پر راضی ہوا۔ یہاں سے واپسی پر عمیر کو اچھی خاصی دیر ہو گئی تھی۔ کھیل کھیل میں اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ دل میں ڈر رہا تھا کہ آج ابو ضرور پٹائی لگائیں گے اور اگر اس نے یہ بتا دیا کہ وہ کھلونوں سے کھیل رہا تھا تو خوب زور کی پٹائی ہو گی۔ وہ ابو کی مار سے بچنے کے لئے کوئی اچھا سا بہانا ڈھونڈ رہا تھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ دیر تک وہ مختلف منصوبے بناتا اور رد کرتا رہا اور پریشان ہوتا رہا۔

"آخر ابو میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟" اس نے بے بسی سے سوچا۔ پچھلے ہفتے اسکول سے چھٹی کے بعد گھر آتے ہوئے اس کے بستے کی پٹی ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے اپنی پاکٹ منی سے اسی وقت موچی بابا سے وہ پٹی جڑوالی۔ اس کام میں اسے کچھ دیر بھی ہو گئی تھی۔ اس دن ابو نے دفتر سے چھٹی کی تھی اور گھر پر ہی موجود تھے۔ دیر سے آنے پر ابو نے اسے خوب ڈانٹا حالانکہ اس نے تاخیر ہونے کی وجہ بھی بتلائی تھی مگر ابو نے اعتبار ہی نہیں کیا۔ وہ کہتے رہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم ضرور وسیم کے گھر گئے ہو گے اور اس کے کھلونوں سے کھیلتے رہے ہو گے۔ اور اب مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ عمیر نے دو ایک بار تو اپنی بات دہرائی مگر جب اس کی بات کو مسلسل جھٹلایا گیا تو وہ خاموش ہو گیا اور ابو کی ڈانٹ سنتا رہا۔ اس وقت بھی وہ سوچ رہا تھا کہ سچ بول کر مار کھانے سے بہتر ہے کہ کوئی مناسب سا بہانا ڈھونڈ لیا جائے۔

گھر پہنچا تو ابو نہیں تھے۔ البتہ امی نے بتایا کہ وہ

عمیر کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ عمیر نے پہلے سے تیار شدہ جواب امی کو سنا دیا۔ "امی امتحان ہونے والے ہیں ناں! سر اسکول ٹائم کے بعد بھی پڑھاتے ہیں۔ اس لئے دیر ہو گئی۔" اور سیدھی سادی امی جان نے عمیر کی بات پر یقین کر لیا۔ بلکہ وہ خوش ہوئیں کہ ان کا بیٹا کتنا لائق اور ہوشیار ہے۔ عمیر بھی اپنی ہوشیاری پر خوش تھا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے ایک بار پھر کتاب کھول کر سامنے رکھی اور وسیم کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرنے لگا۔

اس بات کا یقین ہو جانے کے بعد کہ ابو اسے کھلونے خرید کر نہیں دیں گے، عمیر نے کھیل کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنا شروع کر دیئے تھے۔ وہ کبھی تخیل سے کام لیتا اور بہت سے کھلونے اور ساتھی تخلیق کر کے ان کے ساتھ مزے مزے کے کھیل کھیلتا۔ کبھی اپنی کتابوں کو ساتھی بناتا اور ان کے ساتھ کھیلتا۔ کتابوں والے کھیل میں اس کا پسندیدہ کھیل یہ تھا کہ وہ کتاب کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتا، پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ پھر سوچتا "دایاں صفحہ میرا اور بایاں وسیم کا..... جس کے صفحے پر نقطے زیادہ ہوں گے وہ جیت جائے گا۔" پھر آنکھوں کو بند رکھتے ہوئے کوئی سا بھی صفحہ کھول لیتا اور نقطوں کو گن کر کھیل کا فیصلہ کرتا۔ بعض اوقات وہ حتمی جیت کے لئے سینچری کی حد مقرر کرتا اور گھنٹوں میں جا کر یہ کھیل مکمل ہو پاتا۔

وقت گزرتا رہا۔ عمیر کا کھیل تنہائیوں میں اور وسیم کے کھلونے کی یاد میں جاری رہا۔ امتحان ہوئے۔ رزلٹ نکلا تو عمیر رعائتی نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ یہ بات عمیر کے ابو کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ خود عمیر کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ ابو تو غصے سے پاگل ہو گئے تھے۔ انہوں نے عمیر کی خوب پٹائی کی۔ وہ مارتے جاتے اور عمیر کو طعنے بھی دیتے کہ دیکھا کھلونوں سے کھیلنے کا نتیجہ اور کھیلو وسیم کے گھر جا جا کر..... اسی لئے میں تمہیں کھلونے لا کر نہیں دیتا۔ ابھی تو صرف ایک گھوڑا ہے تو تمہارا یہ حال ہے۔ اگر بہت سے کھلونے ہوں گے تو تم تو بالکل بھی نہیں پڑھو گے ..... چلو آج سے تمہارا کھیل بالکل بند۔ یہ گھوڑا بھی الماری میں بند کر دیا جائے گا۔ اور اس وقت ملے گا جب تم کلاس میں اوّل آؤ گے۔"

مار کھانے کے بعد عمیر سسکتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ وہ رونے کے درمیان میں سوچ رہا تھا۔ "میں کھلونوں سے کب کھیلتا ہوں؟ میرے پاس کھلونے ہیں ہی کہاں ..... بس ایک گھوڑے کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے میرے نمبر اچھے نہیں آئے۔ مگر اتنے سارے کھلونوں سے کھیلنے والا وسیم کلاس میں اوّل کیسے آگیا؟....."

یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اور شاید کبھی آبھی نہیں سکتی تھی۔

بل فائٹنگ

سید کاشان جعفری

ایک حیوانی کھیل جو صدیوں سے جاری ہے!

بل فائٹنگ یعنی سانڈ سے کی جانے والی کشتی اسپین کی سماجی زندگی کا دلچسپ مگر خطرناک مشغلہ ہے۔ اسپین کی تہذیب میں رچ بس جانے والا یہ کھیل دنیا بھر میں صرف ان ممالک میں ہی ذوق و شوق سے کھیلا جاتا ہے جہاں جہاں اسپین کے اپنے اثرات رہے ہیں۔

ایک سانڈ یا کئی کئی سانڈوں کے ساتھ مقابلہ کرنے والے بیباک اور نڈر کھلاڑی (جنہیں ٹیا ڈور کہا جاتا ہے) تماشائیوں کی بے پناہ داد پر کسی

ہر سال تقریباً ۴ بل فائٹر تربیت کے

ہیرو کی طرح خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ تماشائی داد و تحسین دیتے ہوئے خوشی سے پھول، نوبیاں حتیٰ کہ اپنے بھرے ہوئے پرس بھی ان بہادر کھلاڑیوں کے قدموں میں پھینک دیتے ہیں۔

دوسرے ممالک سے پہلی بار اسپین آنے والوں اور بل فائٹنگ کے مظاہرے دیکھنے والوں کو ایڈونچرز کا احساس تو ضرور ہوتا ہے، مگر وہ اس کھیل کی دل کی پوری گہرائیوں کے ساتھ کھل کر تعریف کر سکیں، یہ ممکن نہیں..... ایک بار یا پہلی بار بل فائٹنگ کا مظاہرہ دیکھنا زندگی کے انوکھے اور حیرت انگیز تجربہ سے کم نہیں۔

بل فائٹنگ کا تھیٹر ایک اسٹیڈیم کی ہی طرح تعمیر کیا گیا ہے۔ شائقین سیڑھیوں، بنچوں اور کرسیوں پر اپنے ٹکٹ پر دیئے ہوئے نمبر کے مطابق آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کسی نہ کسی کھانے کی چیز اور مشروب کی بوتلوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ میدان میں اُگی ہوئی گھاس پر پانی چھڑکا جاتا ہے اور فائٹنگ سے پہلے شائقین کے جوش و جذبے کو ابھارنے کے لئے بینڈ پریڈ بھی ہوتی ہے۔ موسیقی کی دلفریب دھن بجاتا ہوا بینڈ کا دستہ گذر جانے کے بعد ایک انتہائی چمک دار شوخ یونیفارم میں ملبوس محافظ گھوڑوں پر سوار میدان میں داخل ہوتے ہیں اور پھر تندرست و توانا سانڈ سے لڑنے کے لئے ٹیاڈور جسے ماریرو بھی کہتے ہیں بڑی شان و شوکت اور کروفر کے ساتھ شائقین کے سامنے آتا ہے۔ لوگ نعرے لگا کر اور پرجوش تالیاں بجا کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ماریرو بھی اپنے سر کو ہلکا سا خم دے کر اپنی خوشی اور جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

ماریرو کے بچاؤ کے لئے اسٹیڈیم کے کئی گوشوں میں ایسے خانے بنے ہوتے ہیں جہاں وہ سانڈ سے بچنے کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے۔

ماریرو اسٹیڈیم میں پہنچ کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے اور اس سے مقابلے کے لئے ساڑھے پانچ سو کلو گرام کے بھاری بھرکم، تندرست و توانا سانڈ کو دوسرے کونے سے میدان میں اتار دیا جاتا ہے۔ اب ماریرو کے تین یا چار معاون میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ چست اور چمکیلے شوخ رنگوں کے لباس پہنے ہوئے ان لڑکوں کے ہاتھوں میں نشتر اور تیز شوخ سرخ رنگ کا کپڑا جسے کیپر کہتے ہیں، ہوتا ہے۔

غصے اور جھنجلاہٹ میں تلملایا ہوا سانڈ ان میں سے کسی ایک کی طرف لپکتا ہے تو وہ محفوظ گوشوں میں سے کسی ایک گوشے میں پناہ لے لیتا ہے۔ سانڈ اب دوسرے معاون کی طرف لپکتا ہے وہ بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ ایک طرف پھرتیلے چاک و چوبند لڑکے اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے ہیں تو دوسری طرف ان کا مقصد بھاری بھرکم سانڈ کو تھکا تھکا کر ہلکان کرنا بھی ہوتا ہے۔

جب سانڈ بڑی طرح تھک کر ہلکان ہو جاتا ہے تب اصل مقابلہ شروع کرنے کے لئے ماریرو

صاحب میدان میں سامنے آتے ہیں۔ وہی نشتر اور سرخ کپڑا یعنی کیپر ہاتھ میں لئے وہ اس سانڈ کو خوب تنگ کرتے اور ستاتے ہیں۔ اس عمل میں سانڈ کو زخمی کر دینا بہت معمولی بات ہے۔

سانڈ کو نشتر چبھویا اور بڑی تیزی کے ساتھ بھاگ کر محفوظ گوشے میں جا کھڑے ہوئے پھر وہاں سے باہر نکلے سانڈ کو تنگ کر کے مزید تھکایا اور پھر محفوظ مقام پر پناہ لے لی۔ یہ عمل کافی دیر تک جاری رہتا ہے۔ شائقین کا جوش و خروش عروج پر پہنچ جاتا ہے وہ "اولے" کہہ کر بل فائٹر کی حکمت عملی کی تعریف کرتے ہیں۔

یہ کھیل انتہائی خطرناک قسم کا ہے اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو سانڈ کے ساتھ اس لڑائی میں انصاف کا پیمانہ قطعی یک طرفہ ہے۔ سارا کھیل ٹاریرو کی حفاظت اور سانڈ کی یقینی موت کے اصولوں پر عمل میں لایا جاتا ہے۔

ٹاریرو کو کسی بھی قسم کا گزند نہ پہنچ سکے؛ اس کے لئے گھوڑے کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ ساتھ ہی گھوڑے کے جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے بھاری گدوں سے گھرا ہوا ایک انتہائی مشاق اور پھرتیلا سوار ہاتھ میں ایک نیزہ لئے ارد گرد موجود رہتا ہے۔

بڑی طرح خون میں لت پت اور تھکن سے ہانپتے ہوئے سانڈ پر کسی کے دل میں بھی رحم کے جذبات نہیں ابھرتے۔ گھوڑ سوار اپنے تیز نوکیلے نیزے سے سانڈ کے جسم میں گہرا زخم ڈال دیتا ہے اور خون کا ایک تیز فوارہ فضا میں پھوٹ پڑتا ہے۔ اس اذیت ناک منظر سے شائقین خوش ہو کر تالیاں بجاتے اور تعریفی کلمات کے نعرے لگانے لگتے ہیں مگر اس بڑی طرح زخمی ہونے اور تھکن سے نڈھال ہونے کے باوجود سانڈ اپنے دشمن سے اچھی طرح واقف ہے۔ اسے علم ہے کہ گھوڑے پر سوار شخص ہی اسے زخمی کرنے کا ذمہ دار ہے۔ وہ انتہائی غصے میں گھوڑ سوار کو دھکا دیتا ہے کبھی کبھی گھوڑا گر بھی پڑتا ہے مگر فوراً ہی دوسرا محافظ سوار سامنے آجاتا ہے۔ اب اپنی بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹاریرو صاحب اس نیم مردہ سانڈ کے جسم میں بار بار نیزہ گھسیڑتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بے جان سا ہو کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑتا ہے پھر بھی اس کی جان بخشی نہیں ہوتی۔ اب یہ سورما ٹاریرو اس کو نجات دلانے کے لئے اس بے زبان پر ایک کاری وار کرتا ہے۔ سانڈ کی کھوپڑی میں تیز دھار خنجر بھونک کر اسے موت کی تاریک وادی میں دھکیل دیتا ہے اور سورما ٹاریرو صاحب اس مردہ سانڈ کے کان کاٹ کر فضا میں اپنا ہاتھ بلند کر کے شائقین کو دکھاتے ہیں۔ یہ منظر شائقین بل فائٹنگ کے جذبات کا نقطۂ عروج ہوتا ہے وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر ٹاریرو کی فتح پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اس کی بہادری پر جذباتی نعرے بلند کرتے ہیں اور آخر میں ایک گھوڑا گاڑی میدان میں آکر اس مرے ہوئے شکست خوردہ بیل کی لاش اٹھا کر لے جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی بینڈ پر فتح یابی کی مسرور کن دھن بجنے لگتی ہے۔ شائقین اس وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خورد و نوش کی اشیا لانے کے لئے لپکتے ہیں کیونکہ یہ شو صرف ایک سانڈ سے لڑائی کے لئے نہیں چھ سات سانڈوں کو بے موت قربانی کا بکرا بنائے جانے کے لئے ہے۔

پانچ سو سے پانچ سو اسّی کلو گرام تک کے وزنی اور تندرست سانڈ اپنی موت کو آواز دینے کے لئے میدان میں آتے ہیں۔ ایک شو میں پانچ یا چھ اس قسم کے خونی مقابلے دکھائے جاتے ہیں۔ وہی کھیل، وہی قواعد وضوابط، وہی بے رحمی اور سفاکی اور مٹیاڈوروں کی ظالمانہ سازش۔

مٹیاڈور کے کمالات

سانڈ کی تو جان اس کھیل میں جاتی ہی ہے مگر مٹیا ڈور کی جان بھی خطرے سے دوچار رہتی ہے اگر وہ برق رفتاری کے ساتھ سانڈ کے حملے سے بچنے کے لئے محفوظ گوشے میں پناہ نہ لے یا سانڈ کے مقابلے میں ذرا بھی سستی دکھا جائے تو سانڈ کے حملے کے نتیجے میں اسے دردناک موت کو گلے لگانا پڑ جاتا ہے۔ ایک تو بے پناہ لوگوں (شائقین) کا ہجوم اور شور ہی سانڈ کو اپنے بچاؤ کا موقع نہیں دیتا، دوسرے مٹیاڈور کے نیزے کے وار اسے بوکھلا دیتے ہیں۔ یوں اس کھیل کے ذریعے اسٹیڈیم میں موجود بیس ہزار تماشائیوں کی تفریح ہوجاتی ہے اور مٹیا ڈور کو معاوضے کی بھاری رقم ..... رہی بات سانڈ کی تو بکرے کی ماں کب تک خیر منائے، اسے تو ایک دن قصائی کی چھری تلے آنا ہی ہوتا ہے۔

صدیوں سے مٹیاڈور کا پیشہ مردوں نے اپنے ہی نام کر رکھا ہے مگر اب خواتین جو انجینئر، پائلٹ پیراکی، گھڑسواری جیسے جان جوکھوں والے مشکل فرائض اور کام کر رہی ہیں۔ اب بل فائٹنگ میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ صرف ۹۰ پونڈ وزن، ۵ فٹ قد اور ۱۹ سال کی مختصر سی عمر کی مالک میرو بیل اٹنچار نامی لڑکی نے پہلی بل فائٹر خاتون ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

میرو بیل بچپن میں مذہبی خیالات کی لڑکی تھی۔ وہ مذہبی خدمات انجام دینے کے لئے خاتون پادری بننے کا خواب دیکھا کرتی تھی۔ اس کے والد ایک غریب مزدور کی حیثیت سے ایک شراب خانے میں کام کیا کرتے تھے اور شام کے وقت بطور پارٹ ٹائم بل فائٹنگ کے اسٹیڈیم میں کام کرتے۔ میرو بیل جب عمر کی ۱۵ ویں منزل میں تھی تو اپنے ابو کے ہمراہ اسٹیڈیم جانے کا اسے اتفاق ہوا۔ وہیں کسی شخص نے مذاقاً اس سے کہا، "بل فائٹنگ مردوں کا کام ہے ..... تم یہاں کیا لینے آئی ہو....." وقت کی بات ..... یہ لفظ اس کے دل و دماغ میں نقش ہو کر رہ گئے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہ کام دنیا کو کر کے دکھائے گی اور ایک کامیاب مٹیاڈور بن کر ہی دم لے گی۔ تین سال تک وہ بل فائٹنگ کی تربیت لیتی رہی۔ ۱۸ سال کی عمر میں اس نے پہلی بار حیرت انگیز پھرتی اور بے

مثال جاں بازی کے ساتھ بل فائٹنگ مقابلے میں حصہ لے کر شائقین کو حیرت زدہ کر دیا۔

اسپین کے دارالخلافہ میڈرڈ کے "ویتانس" نامی اسٹیڈیم امریکہ کے وینزولا اور کولمبیا کے اسٹیڈیمز میں چست لباس میں اس نو عمر لڑکی نے کامیاب بل فائٹنگ کے مظاہرے کر کے نہ صرف شائقین سے داد و تحسین لوٹتے ہوئے بھاری بھرکم سانڈوں کو موت کے گھاٹ اتارا بلکہ ایک شو کی آمدنی میں سے میرو بیل نے اسی ہزار ڈالر بھی کمائے۔

شائقین کی چہیتی بل فائٹر کی آمدنی سے گھر سے غربت دور بھاگ گئی۔ خوش حالی اور فارغ البالی کا دور شروع ہوگیا۔ پھر میرو بیل نے شادی کے بعد بل فائٹنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اسپین کے علاوہ بل فائٹنگ کا کھیل امریکہ کی ریاستوں میں بھی کافی مقبول ہے۔ فروری ۱۹۸۰ء میں کولمبیا، کے شہر سنسی لیجو کی نصف آبادی یعنی تقریباً ایک لاکھ افراد بل فائٹنگ کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے کہ ایک طوفان امنڈ آیا۔ طوفان سے گھبرا کر لوگ بچنے کے لئے ایک چوبی اسٹینڈ کے نیچے جمع ہوگئے، لکڑی کا یہ اسٹینڈ لوگوں کے زبردست دباؤ سے ٹوٹ کر نیچے آگرا اور ۲۳۰ افراد موقع پر ہی ہلاک ہوگئے تھے۔

ماہرین کے محتاط اندازے کے مطابق ہر سال اس کھیل کو سیکھنے والوں میں سے ۲۴ افراد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کھیل میں حصہ لینے اور بطور فائٹر اسے اپنانے والوں کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

ہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اب اکثر لوگ یہ کہتے سنے جاسکتے ہیں کہ مقابلے میں حصہ لینے والے سانڈوں کو اب انجکشن لگا کر سست کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سنا گیا ہے کہ نئے ٹیاڈور میں وہ دم، خم نہیں جو ایلیوینسی جیسے جانباز کی طرح فائٹنگ کا مظاہرہ کر سکیں۔ آج ٹیاڈور کا نصف مقابلہ تو معاون گھوڑ سوار اپنے تیز نیزے سانڈ کے جسم میں بھونک کر انجام دے دیتے ہیں۔ مگر ان پیکاڈور کی خدمت کو کوئی نہیں سراہتا۔

خون خرابے کے اس جان لیوا خطرناک کھیل میں ایک معمولی آدمی نصف ٹن وزن کے سانڈ کو کس طرح بے بس کر کے مار دیتا ہے، یہی بات شائقین کو اسٹیڈیم تک کھینچ لاتی ہے۔ بل فائٹنگ کے تمام مظاہروں کا ٹکٹ چار سے پانچ سو روپے تک کا ہوتا ہے۔ اس کھیل یعنی بل فائٹنگ کا آغاز اسپین میں ہوا تھا اور تیرھویں صدی تک مود قوم کی اس پر اجارہ داری قائم رہی۔

ہم خواہ ایک بار یہ خونخوار کھیل دیکھ کر دوبارہ دیکھنا پسند نہ کریں، مگر اسپین اور شمالی امریکہ کے لوگوں کا ذوق صدیوں سے قائم ہے اور نجانے کب تک رہے گا۔ لطف کی بات کہ اس کھیل کے ظالمانہ طریقوں پر اب تک انسداد بے رحمی حیوانات کی تنظیم نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا، اور نہ کوئی پابندی لگائی۔

گھر بیٹھے ٹیبل لیمپ بنایئے

طیب جمیل قریشی

بچوں کے اسکول کھل گئے ہیں اور پڑھائی کا موسم آگیا ہے۔ ایسے میں ان کو اپنے پڑھنے کی میز کے لئے ایک ٹیبل لیمپ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہوگی۔ اسی ضرورت کے پیش نظر ہم آج آپ کو گھر پر ہی اپنے ہاتھ سے ٹیبل لیمپ بنانا سکھائیں گے۔ اس کے لئے جو سامان درکار ہے وہ تقریباً گھر میں ہی موجود ہوگا۔ بس ایک دو چیزیں بازار سے خریدنا پڑیں گی۔ آیئے اب لیمپ بنانا شروع کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم لیمپ کا اسٹینڈ بنائیں گے۔ اس کے لئے ہمیں لکڑی کا ایک تختہ چاہئے جس کی لمبائی کم از کم ۸ انچ اور چوڑائی کم از کم ۶ انچ ہونی چاہئے اور ہمیں لکڑی کی تقریباً ایک فٹ لمبی پٹی چاہئے۔ اگر اس پٹی کی چوڑائی اور اونچائی برابر ہو تو بہتر ہے ورنہ پھر بھی کام چل جائے گا۔

سب سے پہلے لکڑی کے اوپر والے سرے کے قریب ایک سوراخ کر لیجئے اب پٹی کو تختے کے دائیں سرے سے ایک انچ جگہ چھوڑ کر اس طرح عموداً رکھیں کہ پٹی تختے کی چوڑائی کی طرف سے تقریباً درمیان میں ہو اور پٹی میں موجود سوراخ تختے کی چوڑائی کے رخ میں ہو۔ اب تختے کے نیچے سے کیل لگا کر اس پٹی کو اپنی جگہ پر جوڑ دیں یہ آپ کا اسٹینڈ تیار ہو گیا ہے۔

اب ہم آپ کو لیمپ کے اوپر والا حصہ بنانا سکھائیں گے۔

اس کے لئے آپ بازار سے بلب لگانے والا عام ہولڈر خرید لیں جو بلب کو کسی جگہ لٹکانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

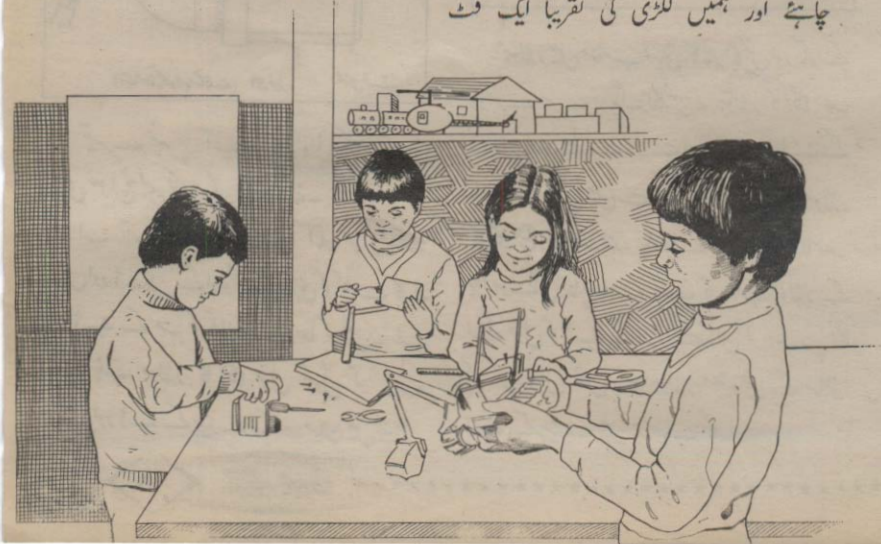

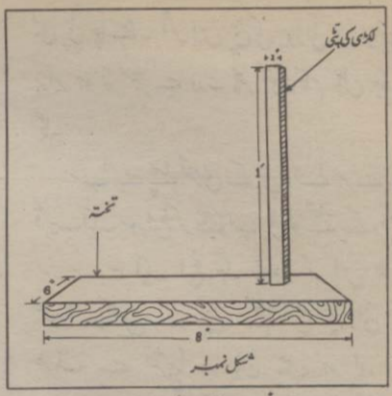

دوسرے نمبر پر آپ ایک عدد نیڈو دودھ کا درمیانے سائز کا خالی ڈبہ لے لیں۔ اس کے علاوہ گھی یا تیل کے چھوٹے ڈبے سے بھی کام چل سکتا ہے۔

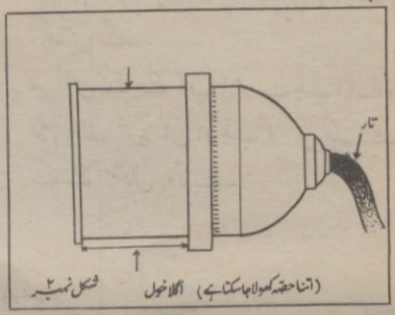

تیسرے نمبر پر آپ کو پہلے والی لکڑی کی پٹی جیسی ۳ انچ لمبی لکڑی کی پٹی چاہئے۔

اب آپ ڈبے کا ڈھکن اتار کر پھینک دیں اور ڈھکن کے ارد گرد کی پتری کو کٹر سے کاٹ کر ڈبے کے منہ کو کھلا اور سیدھا کرلیں۔ اب آپ بلب ہولڈر کا اگلا خول کھول کر علیحدہ کرلیں اور ڈبے کے پیندے کے درمیان میں ہولڈر کے پیچ جتنا موٹا سوراخ کرلیں۔ یاد رہے یہ سوراخ زیادہ کھلا نہ ہو ورنہ ہولڈر نہیں لگے گا۔ اب آپ ۴ انچ لمبی پٹی کے نچلے سرے کے قریب اسٹینڈ والی پٹی کے سوراخ کے برابر سوراخ کرلیں ڈبے کو پٹی کے اوپری حصے پر اس طرح رکھیں کہ سوراخ ڈبے کی گولائی کے رخ ہو نہ کہ لمبائی کے رخ اور پھر ڈبے کے اندر سے کیل لگا کر ڈبے کو پٹی کے اوپر جوڑ دیں۔

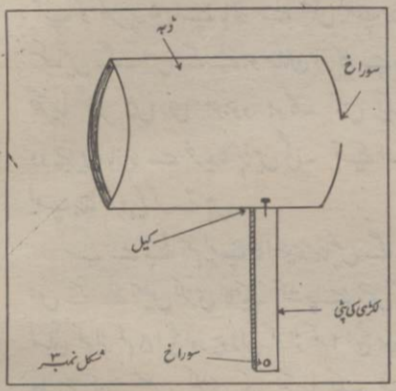

ہولڈر میں مناسب لمبائی کا تار لگائیں اور تار کے دوسرے سرے پر پلگ لگالیں۔ ہولڈر کا اگلا حصہ (خول) تو پہلے سے کھلا ہے اب ہولڈر کو ڈبے کے باہر سے سوراخ میں سے اندر داخل کریں۔ ہولڈر کا اگلا پیچ والا حصہ اندر چلا جائے گا جبکہ پیچھے کا حصہ بڑا ہونے کی بنا پر باہر رہ جائے گا۔ اب ہولڈر کے اگلے خول کو ڈبے کے اندر سے ڈال کر ہولڈر پر لگا کر کس دیں جس سے ہولڈر مضبوطی کے ساتھ ڈبے کے پیندے میں جڑ جائے گا۔

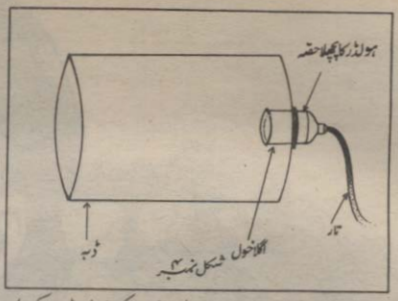

اب آپ اوپر والے حصے کو اسٹینڈ کے اوپر اس طرح رکھیں کہ دونوں پٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں اور دونوں سوراخ ایک دوسرے کے بالکل سامنے ہوں۔ اب اس سوراخ میں ایسا نٹ

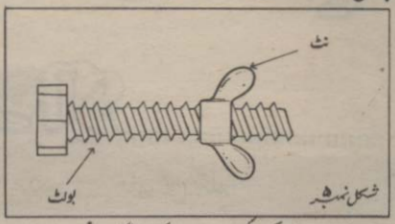

اور بولٹ ڈال کر کسیں جیسا کہ شکل نمبر ۵ میں دکھایا گیا ہے کیوں کہ ایسے نٹ کو ہاتھ کی مدد سے بھی ڈھیلا کیا اور کسا جا سکتا ہے۔ اب آپ کا لیمپ تیار ہے۔

اب آپ اس ڈبے کے اندر ہولڈر میں بلب لگا لیں۔ پلگ لگائیں اور سوئچ آن کریں تو یہ جل اٹھے گا۔ نٹ کو (جو کہ پٹیوں کے سوراخوں میں لگایا گیا تھا) ڈھیلا کر کے اوپر والے حصے کو حسبِ ضرورت جھکا کر جس جگہ سیٹ کرنا چاہیں اس جگہ پر رکھ کر نٹ کو ہاتھ کی مدد سے کس دیں۔

اب آپ کا لیمپ کام کے لئے تیار ہے۔

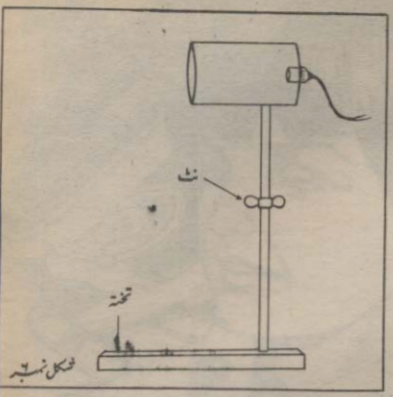

اگر آپ کو بعد میں لیمپ کو جھکانے یا اونچا کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو نٹ کو ڈھیلا کیجئے۔ اوپری حصے کو مرضی کے مطابق ایڈجسٹ کریں اور نٹ کس دیں۔ لیجئے ٹیبل لیمپ تیار ہو گیا۔

اب لیمپ کی روشنی میں خوب پڑھائی کیجئے۔ لیکن ہاں! امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں تو ہمیں مٹھائی کھلانا نہ بھولئے گا۔

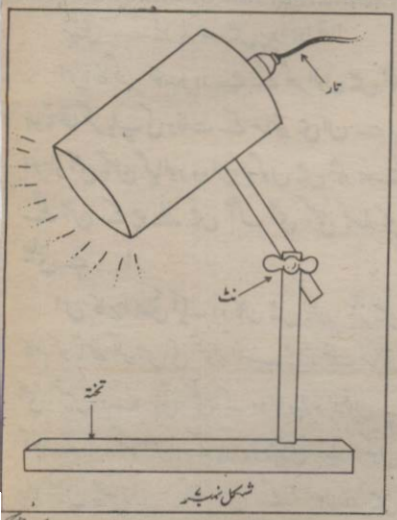

پالش والا

تحریر..... جیرالڈ بیم ترجمہ..... حامد علی شاہد

ٹیڈی ـــــ نیویارک میں پیدا ہوا تھا!

اس کا گھر متوسط درجے کے گھرانوں میں شمار ہوتا تھا مگر باپ کی وفات کے ساتھ ہی ان سے یہ اعزاز بھی چھن گیا اور وہ ان لوگوں میں شمار ہونے لگے جن کے چولھے میں آگ بھی کبھی کبھار ہی جلتی ہے.....!

اس کا بڑا بھائی ایک دوکان میں بطور سیلز مین کام کرتا تھا مگر اس کی تنخواہ نصف مہینے تک ساتھ بھی نہیں دے پاتی تھی کہ وہ دوبارہ فاقوں پہ آجاتے..... مگر اس کے باوجود ٹیڈی نے اسکول جانا نہیں چھوڑا..... تاہم اس کے معمولات میں تھوڑی سی تبدیلی ضرور آگئی تھی۔ وہ اب سردیوں میں اسکول جاتا تھا اور گرمیوں میں سوچوں میں منہمک گھومتا پھرتا..... وہ دراصل کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا چاہتا تھا جو اسکے گھر کے حالات کو بہتر بنا سکے۔

گرمیوں میں چند شریر لڑکے دبے پاؤں اپنے گھروں سے نکلتے اور بوڑھی خاتون مسز واٹسن کا نلکا کھول کر دوبارہ تیزی سے ایک دوسرے کے تعاقب میں کسی کونے کھدرے میں چھپ جاتے..... پانی گرنے کی آواز سن کر مسز واٹسن غصے میں بڑبڑاتی ہوئی باہر نکلتی اور تیزی سے نلکا بند کر دیتی۔

"اے..... کیا یہ تمہاری شرارت ہے؟" وہ ہاتھ کا چھجا بنا کر گھور کر اسے دیکھتی۔

ٹیڈی پتلون میں ہاتھ گھماتے ہوئے کندھے اچکاتا اور پھر اس کونے کی طرف دیکھنے لگتا جس میں چند لمحے قبل وہ شریر لڑکے چھپ گئے تھے۔ مسز واٹسن اشارہ سمجھتے ہی جب تک وہاں پہنچتی..... لڑکے شور مچاتے ہوئے بھاگ جاتے۔

"ان لڑکوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔" وہ ہمیشہ ٹیڈی کو اونچی آواز میں اپنا دکھڑا سناتی۔ "کسی دن میں ان کی اتنی پٹائی کروں گی کہ یہ اس گھر کے نزدیک پھٹکنا بھی چھوڑ دیں گے....."

مگر ٹیڈی کو اس کے معمول کے لیکچر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ دوبارہ خلاؤں میں گھورتا ہوا آگے نکل جاتا..... وہ جب تک اپنی گلی میں داخل ہوتا، اسے آئس کریم والے کی گھنٹی بجتی سنائی دیتی۔ گلی کے ارد گرد سے مختلف گھروں کے کواڑ کھلتے اور مائیں اپنے بچوں کے ہمراہ آئس کریم لینے آجاتیں۔ مگر ٹیڈی کے گھر کا دروازہ کبھی بھی نہیں کھلا۔ اس کی ماں کے پاس آئس کریم کیلئے پیسے نہیں تھے۔

"تم کوئی کام کیوں نہیں کر لیتے!!" ایک دن اس کے پڑوسی مسٹر براؤن نے اسے مشورہ دیا۔

"کام.....!" اس نے حیرت سے اپنی نیلی آنکھوں سے مسٹر براؤن کو گھورا۔ "مگر میں تو بہت چھوٹا ہوں ابھی!!"

"ارے نہیں ٹیڈی.....!" مسٹر براؤن ہنسے اور پھر سمجھاتے ہوئے بولے، "تم اب اتنے چھوٹے بھی نہیں ہو۔ میں تمہاری عمر میں ایسا ہی کرتا تھا۔ تم گرمیوں میں کام کر لیا کرو اور سردیوں میں اسی رقم کو اپنی تعلیم پہ خرچ کر لیا کرو.....!!"

"آپ بھی ایسا ہی کرتے تھے کیا؟" ٹیڈی کی آنکھوں میں اشتیاق جھلک آیا۔

"ہاں..... تم بالکل ٹھیک سمجھے۔" مسٹر براؤن ہنسے اور اندر چلے گئے۔

ٹیڈی سر جھکائے سوچنے لگا۔ اسے یہ مشورہ بے حد پسند آیا تھا۔ وہ مسٹر براؤن کی طرح نہ صرف اس طرح موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کر سکتا تھا بلکہ بڑا ہو کر کوئی بڑا سا آفیسر بھی بن سکتا تھا۔

"مجھے یقیناً اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونا چاہئے۔! بھائی اور امی اب مزید میرے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔" اس خیال کے ساتھ ہی اس کا رخ ٹیلر ماسٹر کی طرف ہو گیا۔ وہ دکان کو صاف رکھنے کے علاوہ ٹیلر ماسٹر کی اور بھی کئی کاموں میں مدد کر سکتا تھا۔

"نہیں....." ٹیلر ماسٹر نے اس کے سوال کا جواب فوراً دے دیا۔ "میں دکان کو صاف خود بھی رکھ سکتا ہوں اور اسکے علاوہ بھی تم میری کیا مدد کر سکتے ہو۔ میرے پاس کوئی ایسا کام ہے ہی نہیں۔ جو تمہارے کرنے کیلئے ہو۔"

"کام....." مسٹر جانسن، دھاتی اشیا کی دکان کے مالک نے اس کی بات پوری بھی نہ سنی۔ "تم ابھی دس سال کے بھی نہیں ہوئے ٹیڈی اور تم بھلا اتنی بھاری اشیا کیسے اٹھاسکو گے؟"

"میں اٹھالوں گا....." ٹیڈی نے احتجاج کرنا چاہا۔

"مجھے افسوس ہے ٹیڈی، تمہیں تو پتا ہے کہ دھاتیں کس قدر بھاری ہوتی ہیں....." یہ کہہ کر مسٹر جانسن کام میں جُت گئے، گویا وہ اس موضوع پر مزید نہیں بولنا چاہتے تھے۔

ٹیڈی نے مزید کئی دکانیں چھان ماریں مگر کوئی بھی اس کی کم عمری کے باعث اسے کام دینے کیلئے تیار نہیں تھا۔ وہ تھک کر مایوس انداز میں گھر کی طرف ہولیا۔ اسے سب لوگوں کی اس حد درجہ سنگدلی پر غصہ آرہا تھا اور اپنی بے بسی پہ رونا بھی آرہا تھا۔

"چمکاؤ چمکاؤ..... اپنے جوتے چمکاؤ۔"

یہ آواز اس کے کانوں میں دفعتاً پڑی..... تو وہ چونک پڑا..... اس نے حیرت سے اس لڑکے کو دیکھا جس کے گلے میں ایک بڑا سا بکس لٹک رہا تھا اور ہاتھ میں پالش کرنے والا ایک برش..... وہ لڑکا اس سے ذرا ہی بڑا تھا۔

"ہیلو..... تمہارا نام جون ہی ہے نا؟" ٹیڈی نے اسکے اٹھتے قدموں کو روک لیا۔ وہ پل بھر کے لئے اسکی طرف پیٹھ کئے کھڑا رہا..... اور پھر ٹیڈی کی طرف مڑا تو اس کے چہرے پہ شناسائی کے تاثرات تھے۔ ٹیڈی اسے اچھی طرح جانتا تھا وہ جون ہی تھا اس کا کلاس فیلو....."

"تم نے صحیح پہچانا..... ٹیڈی۔" اس نے ٹیڈی سے ہاتھ ملایا اور پھر دونوں گپ شپ لگانے کے لئے وہیں دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔

ٹیڈی جب جان سے رخصت ہوا تو اس کی جیب میں کچھ رقم تھی جس سے وہ پالش کا سامان آسانی سے خرید سکتا تھا۔ یہ رقم اس نے جان سے ادھار لے لی تھی۔ اس نے ایک جنرل اسٹور سے تمام سامان خریدا..... اسے لکڑی کے ایک بکس میں بند کرلیا اور پھر بکس کو گلے میں لٹکا کر وہ بازار کی طرف ہولیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے پھولا ہوا تھا۔

"چمکاؤ چمکاؤ..... اپنے جوتے....."

دو جوتے اس کے بالکل سامنے آکر رک گئے۔ انہیں چمکانے کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ ٹیڈی کی نظریں اس کی ٹانگوں کا تعاقب کرتی ہوئیں کسی کے کرخت چہرے پر آکر رک گئیں..... وہ ایک پولیس مین تھا۔ "بھاگ جاؤ احمق..... تمہیں یہاں پر بیٹھنے کی کس نے اجازت دی ہے؟"

ٹیڈی چلتا رہا، چلتا رہا اور بالآخر وہ ایک اور ایسی ہی عمارت کے سامنے رک گیا۔ یہاں لوگوں کی بھرمار بھی تھی اور بیٹھنے کے لئے ٹھنڈی جگہ بھی..... اس نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔

"چمکاؤ چمکاؤ..... اپنے جوتے چمکاؤ!!!"

"اے چھوٹے..... تم یہاں جوتے پالش

نہیں کر سکتے.....!!" عقب سے گارڈ کی آواز سن کر اس کا چہرہ لٹک گیا۔

"مگر کیوں؟" اس نے احتجاج کیا۔ "مجھے ہر جگہ سے بھگا دیا جاتا ہے۔ آخر کیوں.....؟" ٹیڈی نے گویا شکایت کر ڈالی۔

"تم لائبریری کے سامنے کیوں نہیں چلے جاتے.....؟" ٹیڈی کے ننھے چہرے پر مایوسی دیکھ کر گارڈ کا لہجہ نرم ہو گیا۔ "وہاں میں نے پالش والے بہت سے لڑکے دیکھے ہیں....."

ٹیڈی چلتا رہا، چلتا رہا..... اس کا رخ لائبریری کی طرف ہی تھا۔

اسے دور سے ہی لڑکے آوازیں لگاتے نظر آ گئے۔

"ٹیڈی!!"

ٹیڈی نے سر اٹھا کر دیکھا اسے آواز دینے والا جان ہی تھا۔ وہ اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلا رہا تھا اس کے ارد گرد چند لڑکے کھڑے اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

ٹیڈی نے بکس کو زمین پر رکھا اور اسے تکیہ سمجھ کر لیٹ گیا..... لوگ آتے رہے اور جوتے پالش کرواتے رہے۔ مگر کوئی بھی ٹیڈی کے سامنے نہیں رکا۔ ٹیڈی جھنجھلا اٹھا! "آخر کوئی مجھ سے جوتے پالش کروانے کے لئے تیار کیوں نہیں....." وہ یوں جان پر برس پڑا جیسے یہ سب کیا دھرا اسی کا ہے۔ ایک لڑکے نے اس کی آواز سن لی۔ وہ گردن لمبی کر کے بولا۔ "تم بالکل چھوٹے سے بچے لگتے ہو ٹیڈی..... اپنے نام کی طرح..... اور کوئی بھی اتنے ننھے منے بچے سے جوتے پالش کرانا پسند نہیں کرتا۔" اس کی اس بات پر دوسرے لڑکوں نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ ٹیڈی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

وہ سارا دن گزر گیا۔ مگر کسی ایک آدمی نے بھی ٹیڈی سے جوتے پالش نہیں کرائے۔ ٹیڈی نے اس جگہ کو بھی الوداع کہا اور آگے بڑھ گیا..... اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ کوئی بھی اس سے جوتے پالش کرانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا اور وہ سارا دن بغیر کام کے تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے اس نے گھر کا رخ کیا۔ وہ مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا سپر مارکیٹ آ گیا۔ جہاں ابھی تک لوگوں کی بھیڑ تھی۔

"اس بکس میں کیا ہے؟" ایک چھوٹے سے بچے نے اسے آواز دی۔

"پالش کا سامان ہے اس میں..... کیوں؟" ٹیڈی کا لہجہ ترش ہو گیا۔

"میرے جوتے پالش کرو گے.....؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارے جوتے.....؟؟" ٹیڈی نے حیرت سے آنکھیں گھمائیں اسے یقین تھا کہ اس بچے کی جیب میں اسے دینے کے لئے ایک پائی بھی نہیں ہو گی۔ مگر اس کے باوجود اس نے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ اسے صرف ایک بات کا اطمینان تھا کہ

کسی نے اسے جوتے پالش کرنے کے لئے کہا ہے..... اور بس!

اس نے فوراً بکس کھولا..... پالش کی ڈبیا نکالی..... ایک چھوٹا سا کپڑا اور ایک برش..... پہلے اس نے جوتے صاف کئے۔ پھر جوتوں پہ تھوڑی سی پالش لگا کر مہارت سے برش رگڑا..... "گھررر..... گھررر..... گھررر....."

چند لمحوں کے اندر ہی جوتے چمکنے لگے۔

"بل..... تم کیا کر رہے ہو یہاں.....؟" اسی لمحے ایک خوش پوش خاتون جو نزدیکی دکان سے باہر نکلی تھی، حیرت سے بولی۔

پھر ٹیڈی کی موجودگی محسوس کرتے ہی اس کے چہرے پہ اطمینان آگیا۔ "بہت خوب..... تم نے تو کمال کر دیا منے!!"

خاتون کی تعریف سے ہی ٹیڈی کا سینہ دگنا ہوگیا۔ اسے اپنی اجرت صرف انہی دو باتوں سے مل گئی تھی۔

"کتنا معاوضہ ہے تمہارا.....؟"

"معاوضہ؟"

"ہاں..... معاوضہ.....؟؟"

ٹیڈی نے چمکتی نگاہوں سے چند لمحے خلاؤں میں گھورا..... پھر کچھ سوچ کر بولا! پانچ سینٹ..... ٹھیک رہیں گے..... کیا....."

"تم بہت اچھے بچے ہو....." خاتون نے مسکرا کر تبصرہ کیا اور اسے دس سینٹ دے کر بولی۔ "باقی تمہارا انعام.....!!"

ٹیڈی بکس سنبھال کے جانے ہی لگا کہ اسے مزید دو بچے نظر آئے..... ان کے جوتے پالش کرنے کے دوران وہاں اچھا خاصا بچوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا..... تاہم جب وہ گھر جانے لگا تو اس کی جیب اچھی خاصی بھاری ہوچکی تھی۔

پھر ٹیڈی کا معمول بن گیا۔ وہ روزانہ صبح سویرے سپر مارکیٹ پہنچ جاتا اور اس کا سارا دن بچوں کے جوتے پالش کرنے میں گزرتا۔ کئی بچے اس کے دوست بھی بن گئے تھے۔

اس کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہوچکی تھی۔ اس نے جان سے قرض لی ہوئی رقم بھی اسے واپس کر دی تھی۔

ایک روز اس نے ایک ایسی جگہ بھی ڈھونڈھ لی جہاں ارد گرد جوتے پالش کرنے والا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ مجبوراً لوگوں کہ اسی سے جوتے پالش کروانے پڑے اور اس نے اس دن سب سے زیادہ رقم کمائی۔

پھر اس نے سپر مارکیٹ جانا چھوڑ دیا..... مگر سارا دن بے چینی اور ترشی میں گزرتا۔ کوئی شخص بھی اس سے نرمی سے بات کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ یوں اسے بات بے بات ڈانٹتے جیسے اس نے کوئی بھیانک غلطی کر ڈالی ہو۔

ایک صبح اس نے رستہ تبدیل کر لیا۔ اس کی منزل سپر مارکیٹ تھی..... وہ تیز تیز قدموں سے سپر مارکیٹ جا رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں جو خلا پیدا ہوگیا تھا وہ بھر گیا تھا..... وہ پورے دو ماہ کے بعد

ادھر کا رخ کر رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ سب کچھ پیسہ تو نہیں ہوتا نا!

سپر مارکیٹ کے احاطے میں داخل ہوتے ہی ایک نعرہ لگا۔ "ٹیڈی..... آگیا .....ٹیڈی آگیا..... چمکاؤ چمکاؤ..... اپنے جوتے چمکاؤ.....!!!" افسردہ بچے خوشی سے ناچنے لگے۔

والدین حیرت سے اپنے بچوں کو ایک میلے کچیلے بچے کی طرف خوشی سے دوڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ یہ دیکھنے سے قاصر تھے کہ اس میلے کچیلے مگر ننھے منے بچے کی اجلی روح کتنی شدت سے مسرت سے جھوم رہی ہے۔

The First name in Bicycles, brings ANOTHER FIRST

SOHRAB VIP sports

Sohrab the leading national bicycle makers now introduce the last word in style, in elegance, in comfort, absolutely the last word in bicycles.

PAKISTAN CYCLE INDUSTRIAL COOPERATIVE SOCIETY LIMITED
National House, 47 Shahrah-e-Quaid-e-Azam Lahore Pakistan

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا !

۱۔ فرہاد اور اس کے ابو کی عمروں میں تین اور سات کی نسبت ہے۔ دس سال پہلے یہ نسبت ایک اور چار کی تھی فرہاد کے ابو کی عمر بتائیے ۔

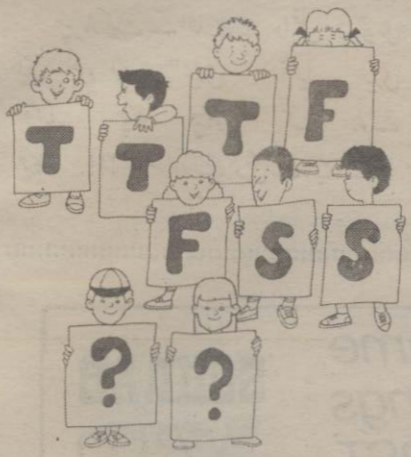

۲۔ بتائیے ۔ مندرجہ بالا سلسلے میں اگلے دو حروف کون سے ہوں گے ۔

۳ ۔ پبلک لائبریری کے ۷۵۰ ممبران میں سے ۲۷۵ ممبران ادب پڑھنا پسند کرتے ہیں جبکہ ۴۶۵ ممبران صرف افسانے یا صرف افسانے اور تاریخ پڑھنا پسند کرتے ہیں. اگر لائبریری کا ہر ممبر تینوں مضامین میں سے ایک یا ایک سے زیادہ مضامین کو پسند کرتا ہے تو صرف تاریخ کو پسند کرنے والے ممبران کی تعداد کیا ہوگی ۔

۴ ۔ تین تین افراد پر مشتمل، تاش کے کھلاڑیوں کی تین ٹیمیں ہیں ۔ انہوں نے پانچ گیمیں کھیلیں۔ کھیل میں ہر مرتبہ ہر ٹیم کا ایک ایک کھلاڑی شامل ہوا ۔ پہلی گیم میں ارشاد فرید اور جمیل شریک تھے۔ دوسری میں انور، دانیال اور پرویز شریک تھے ۔ جبکہ تیسری اور چوتھی گیم بالترتیب تنویر، جاوید اور پرویز اور جاوید، جمال اور ارشاد کے درمیان ہوئی ۔ پانچویں اور آخری گیم میں انور، جاوید اور نعیم شریک تھے۔ ہر ٹیم کے تینوں کھلاڑیوں کے نام بتائیے ۔

(جوابات اگلے شمارے میں)

کُلکُلے

انعامی لطیفہ

علامہ اقبال کی دوستی ایک سکھ سے ہوگئی تھی۔ ایک دن وہ سکھ علامہ اقبال کے گھر آیا ہوا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ اوپر سے بارش شروع ہوگئی۔ علامہ اقبال بولے

"سردار جی، اب بارش میں کہاں جائیں گے، یہیں ٹھہر جائیں۔"

سردار جی مان گئے۔ اتنے میں علامہ کسی کام سے اندر گئے۔ واپسی پر سردار جی غائب تھے۔ علامہ بڑے پریشان ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد سردار جی بھیگتے ہوئے اندر آئے تو علامہ نے پوچھا "سردار جی کہاں گئے تھے؟" سردار جی بولے

"ہم ذرا سلیپنگ سوٹ پہننے گھر تک گئے تھے۔"

عبدالحفیظ شاہد ...... خانیوال

استاد (لڑکوں سے) "کل میں نے تمہیں دوست کے نام خط لکھنے کے لئے کہا تھا وہ آپ نے لکھ لیا؟"

لڑکے ...... "جی ہاں۔"

استاد ...... "لاؤ میں دستخط کر دوں۔"

لڑکے ...... "جناب وہ تو ہم لیٹر بکس میں ڈال آئے ہیں۔"

مرسلہ ...... عبدالنعیم صدیقی کراچی

گاہک (منیجر سے) "ایک گھنٹہ ہوگیا ہے انتظار کرتے کرتے، ابھی تک کھانا نہیں آیا۔ کیا ابھی تک پکا نہیں ہے؟"

منیجر ...... "نہیں صرف گرم ہو رہا ہے۔ پک تو پچھلی جمعرات کو ہی گیا تھا۔"

مرسلہ ...... شاہ نواز گل، پشاور

کمرۂ عدالت میں گرما گرم بحث چل رہی تھی۔

وکیل کے ایک ہاتھ میں چھڑی تھی، وکیل نے چھڑی سے ملزم کی طرف اشارہ کر کے کہا، "جنابِ اعلیٰ چھڑی کے اس سرے پر انسان نہیں شیطان کھڑا ہے۔"

ملزم نے حیرانگی سے کہا، "حضور کس سرے پر؟"

مرسلہ..... الطاف مجاہد، کراچی

ایک سرکاری عمارت کی کھڑکیاں صاف کرنے پر مامور شخص سے اس کے دوست نے پوچھا،

"کھڑکیاں صاف کرنے کے دوران تمہیں بعض اوقات حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین مناظر بھی نظر آتے ہوں گے؟"

"یقیناً! آج ہی پانچویں منزل کی کھڑکیاں صاف کرتے ہوئے میں نے ایک دفتر دیکھا جہاں سب لوگ کام کر رہے تھے۔"

مرسلہ..... محمد ظفر ضیاء، کمالیہ

"بیٹے ایک اور آئس کریم کھاؤ گے؟" تفریح گاہ میں ایک کنجوس شخص نے پوچھا۔ بیٹا حیرانی سے بولا، "لیکن ابو میں نے تو کوئی آئس کریم نہیں کھائی۔"

باپ نے کہا، "تم بھول رہے ہو بیٹے! پچھلے سال جب ہم یہاں آئے تھے تو کیا تم نے ایک آئس کریم نہیں کھائی تھی؟"

مرسلہ..... محمد سعید گلاب کورنگی، کراچی

ایک مرتبہ ایک وزیر پاگل خانے کا دورہ کرنے تشریف لائے۔ پاگلوں نے انہیں دیکھ کر تالیاں بجائیں اور ان کا استقبال کیا اور نعرے لگانے لگے۔

پاگل خانے کا منتظم خاموش کھڑا تھا، وزیر نے کہا "تم کیوں خاموش کھڑے ہو؟"

منتظم نے کہا، "میں پاگل نہیں ہوں۔"

مرسلہ..... عبیداللہ میمن، سکھر

ایک پروفیسر صاحب اپنے کسی دوست کے گھر رات کے کھانے پر گئے۔ انہوں نے لال ٹین اپنے ساتھ اس خیال سے لے لی کہ اگر بجلی چلی گئی تو اندھیرے میں پریشانی نہیں ہوگی۔ رات کے دس بجے وہ دعوت سے فارغ ہو کر اپنے گھر واپس آئے۔ دوسرے دن ان کو اپنے دوست کے ملازم کے ہاتھ ایک پرچہ ملا۔ اس میں لکھا تھا، "آپ کی لال ٹین بھیج رہا ہوں، آپ میرے طوطے کا پنجرہ بھجوا دیجئے۔"

مرسلہ..... برکت علی ہزارہ، سانگھڑ

ایک آدمی نے اپنے دیہاتی دوست سے کہا، "چلو شہر کی سیر کر آئیں۔"

دیہاتی نے جواب دیا، "دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ شہر جاؤں مگر وہاں جگہ جگہ جو ہدایتیں درج ہوتی ہیں ان پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً پچھلے ہفتے میں شہر گیا تو میں نے دیکھا، ایک جگہ لکھا تھا، "یہاں تھوکئے"، مجھے وہاں تھوکنا پڑا۔ دوسری جگہ لکھا تھا "ردی کاغذ

اس میں ڈالیں" میں نے سڑک سے ردی کاغذ اٹھا کر اس میں ڈال دیئے۔ چند قدم آگے بڑھا تو لکھا تھا، "رفتار چالیس میل فی گھنٹہ" بھلا بتاؤ، میں بوڑھا آدمی اتنی تیز رفتاری سے کیسے دوڑ سکتا تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا، میں نے چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ لگا دی۔ اور آئندہ شہر جانے سے توبہ کرلی۔"

مرسلہ..... حمیرا شاہین، پشاور کینٹ

ایک شخص (دوسرے سے) "بھائی صاحب، آج تاریخ کیا ہے؟"

دوسرا شخص..... "جناب میں نہیں جانتا۔"

پہلا شخص..... "تو بھائی صاحب، آپ اپنی جیب میں پڑے اخبار سے کیوں نہیں بتا دیتے ہیں؟"

دوسرا شخص..... "جناب، کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ کل کا اخبار ہے۔"

مرسلہ..... سعدیہ امین، اوکاڑہ

ایک بچہ اسکول دیر سے پہنچا تو استانی نے کہا، "تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسکول آٹھ بجے شروع ہوجاتا ہے۔"

بچے نے جواب دیا، "مس وقت کی پابندی ضروری ہے آپ میرا انتظار مت کیا کریں، اسکول شروع کردیا کریں۔"

مرسلہ..... لبنیٰ ارشاد قریشی، خان پور ڈیم

ڈاکو کو اس کے جرائم کی سزا کے طور پر فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کیا جاچکا تھا۔ اسکواڈ کے کیپٹن نے مرنے سے پہلے اس کی آخری خواہش پوچھی۔ ڈاکو نے کہا، "بہتر ہوگا تم مجھے پانی کا ایک گلاس پلوا دو۔"

کیپٹن نے حیرت سے کہا، "تم پانی مانگ رہے ہو، ویسے اگر تم چاہو تو میں تمہیں سگریٹ پلوا سکتا ہوں، اس سے تمہارے اعصاب پر اچھا اثر پڑے گا۔"

"اوہ نہیں! ڈاکو نے جواب دیا، میں پانی ہی پینا چاہتا ہوں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ میں اب سگریٹ ترک کرنا چاہتا ہوں۔"

مرسلہ..... رضوان کریم، جوٹیال گلگت

ایک دولت مند افریقی سردار ایک مرتبہ انگلستان گئے۔ جہاں اس کے میزبانوں نے اسے کرکٹ میچ دکھانے کا اہتمام کیا۔ لنچ کے وقت اسے بہترین کھانا فراہم کیا گیا۔ مشروبات بار بار پیش کئے جاتے رہے لیکن اس کے باوجود وہ دولت مند افریقی سردار کچھ لاتعلق سا نظر آنے لگا۔ کھیل کے اختتام پر میزبان نے پوچھا، "کہئے آپ کو یہ کھیل کیسا لگا؟"

"اچھا ہے۔" افریقی سردار نے کہا۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کیا؟" میزبان نے اشتیاق سے پوچھا۔

"گیند کو بلے سے مارنے کے بعد کھلاڑی خود ہی کیوں دوڑنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ کام ملازم سے کیوں نہیں لیا جاتا؟" سردار نے کہا۔

مرسلہ..... شاہ رخ ہمایوں، پنڈی بھٹیاں

وکیل کو مؤکل نے ایک مقدمہ جیتنے پر چمڑے کی ایک خوبصورت تھیلی دیتے ہوئے کہا، "یہ تھیلی خود میرے ہاتھ کی بنی ہوئی ہے۔ آپ یقیناً اسے پسند کریں گے۔"

وکیل بولا، "مگر میں تو نقد فیس لیتا ہوں۔"

مؤکل، "کتنی فیس لیں گے آپ؟"

وکیل، "تین ہزار روپے۔"

مؤکل نے تھیلی کھولی، اس میں سے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکالی اس میں سے تین ہزار کے تین نوٹ گن کر وکیل کو دیئے۔ اور بقیہ نوٹ تھیلی میں ڈال کر تھیلی کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

مرسلہ..... محمد عمران، کراچی

ایک سگریٹ ساز ادارے کی کمپنی کو جب یہ معلوم ہوا کہ وادی گلگت میں ایک ایسا بوڑھا رہتا ہے جس کی عمر سو سال ہونے والی ہے اور وہ گزشتہ اسی سال سے سگریٹ پی رہا ہے تو اس نے اس سے فوراً ملنے کے لئے اپنے ادارے کے ایک سینئر افسر کو روانہ کر دیا۔

افسر نے گلگت پہنچ کر اسے تلاش کیا اور کہا "بڑے صاحب! کل ہم ہوائی جہاز سے اسلام آباد چلیں گے اور وہاں سے کراچی۔ وہاں ہم آپ کی سوویں سالگرہ منائیں گے۔ اسی روز ہم اپنے سگریٹ کے اشتہاری پروگرام میں آپ کا انٹرویو براہِ راست پیش کریں گے۔ اوپر کے خرچ کے بعد ہم آپ کو پچاس ہزار روپے نقد بھی پیش کریں گے۔"

بوڑھے شخص نے جواب دیا۔ "تجویز اچھی ہے مگر ٹی وی پروگرام صبح کے وقت مت رکھئے گا۔" افسر نے حیرت سے پوچھا، "وہ کیوں؟" بوڑھا بولا، "کیونکہ دوپہر تک کسی بھی طرح میری کھانسی نہیں رکتی۔"

مرسلہ..... سہیل عباس، ساہیوال

آسمان نیلا کیوں ہے؟

شگفتہ شمیم

آسمان نیلا کیوں ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہم میں سے اکثر لوگوں کے ذہن میں ابھرتا ہے مگر اس کا صحیح جواب بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کیونکہ اس بظاہر سادہ سے سوال کا جواب اتنا ہی پیچیدہ ہے جسے سمجھنے کے لئے ہمارے لئے بہت سی دوسری باتوں کا جاننا ضروری ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آسمان کوئی ٹھوس شے نہیں بلکہ ایک خلا ہے جو ہوا، لاتعداد قسم کی گیسوں اور سورج سے نکلنے والی مختلف قسم کی شعاعوں سے پُر ہے۔ سورج ہماری زمین سے ایک سو پچاس ملین کلو میٹر کے فاصلے پر ہے مگر اس کی روشنی نہایت ہی مختصر وقت میں یعنی صرف آٹھ منٹ میں ہماری زمین تک پہنچ جاتی ہے۔ روشنی کی اس رفتار کا اندازہ ہم اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی ریسنگ کار ایک ہزار کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کرے (جو کہ ناممکن ہے) تو اتنا ہی فاصلہ سترہ گھنٹوں میں طے کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سورج کی روشنی کو جو دیکھنے میں سفید رنگ کی ہوتی ہے، بہت سارے رنگوں کی شعاعوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو اپنی تیز رفتاری کے باعث ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہو کر سفید رنگ بناتی ہیں۔

سورج کی روشنی نیلی، جامنی، سبز، زرد، سرخ اور نارنجی شعاعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ شعاعیں دراصل توانائی کے پیکٹ کی شکل میں ہوتی ہیں جن کو "فوٹون" کہتے ہیں۔ زمین کی جانب یہ شعاعیں لہروں کی شکل میں اور سیدھی لائن میں سفر کرتی ہیں۔ نیلے رنگ کی شعاعوں میں توانائی کے پیکٹ زیادہ اور قریب قریب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ان لہروں کی (Wavelength) یا لہر کی اونچائی کے درمیان کا فاصلہ کم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیلی شعاعیں زیادہ تیز رفتاری سے سفر کرتی ہیں۔ سرخ اور نارنجی شعاعوں میں توانائی کے پیکٹ کم مقدار میں اور دور دور ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ان کی (Wavelength) زیادہ ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ شعاعیں دوسری شعاعوں کے مقابلے میں ذرا سست رفتار ہوتی ہیں۔

سورج کی روشنی جب نہایت تیزی سے سفر کرتی ہوئی زمین کی فضا میں داخل ہوتی ہے تو پہلے سے

موجود گرد و غبار سے ٹکرا کر بکھر جاتی ہے۔ نیلی شعاعوں میں چونکہ زیادہ توانائی ہوتی ہے اس لئے یہ شعاعیں گرد و غبار کے ان باریک باریک ذرّات سے ٹکرا کر زیادہ تیزی سے بکھرتی ہوئی پورے آسمان پر پھیل جاتی ہیں جس کی وجہ سے آسمان نیلے رنگ کا نظر آتا ہے۔ جبکہ سرخ اور نارنجی شعاعیں آہستہ آہستہ پھیلتی ہیں اور سورج کے قریب ہی موجود رہتی ہیں۔

طلوعِ آفتاب کے وقت یا شام کے وقت جب سورج غروب ہو رہا ہو تو ان شعاعوں کو ہم سورج کے آس پاس بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔

○ ..... ایک دفعہ خانہ جنگی کے دوران ابراہم لنکن کی طرف سے فوجیوں کو حکم ملا کہ ہر کارروائی کی رپورٹ بلا تاخیر روانہ کی جائے۔

ایک دن ابراہم لنکن کو تار ملا۔ "جناب چھ گائیں ہاتھ لگی ہیں ان کا کیا کیا جائے؟"

ابراہم نے جواب بھیجا۔ "ان کا دودھ نکال لیا جائے۔"

(مرسلہ ..... علی جہان۔ خانیوال)

کرشمہ

قسط نمبر ۱۰

اظہر نیاز

جواد، ذیشان کا دوست تھا۔ وہ حیرت انگیز صلاحیت کا مالک تھا جسے ذیشان کے ابو آغا عمران نے چھٹی حس کا نام دیا تھا۔ جواد کو آنے والے خطرات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا اور اس حس کا مظاہرہ وہ اکثر کرتا رہتا تھا۔ آغا عمران پولیس افسر تھے۔ جواد نے کئی کیسوں میں ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ جواد کو ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ آغا عمران نے اپنے ایک دوست پروڈیوسر انصاری صاحب، سے سفارش کر کے جواد کو ڈراموں میں کام کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ انصاری صاحب بھی جواد کی پراسرار قوت سے، بہت متاثر ہوئے ریہرسل کے دوران جواد کی ملاقات مس نائلہ سے ہوئی جو شہر کے ایک بااثر شخص کی بیٹی تھی۔ آغا عمران اور انسپکٹر شعیب کا خیال تھا کہ نائلہ کا باپ، سخی بٹ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے مگر ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ انسپکٹر شعیب مسلسل [illegible] ہو رہے تھے [illegible] طرف چند پراسرار سے لوگ مسلسل جواد کے تعاقب میں تھے۔ وہ سر راہ اسے روک کر راستہ پوچھتے اور اس کے خلاف عمل کر کے جواد کی پیش گوئیوں کا امتحان کرتے جو اکثر صحیح ثابت ہوتیں۔ پولیس ان افراد کی نگرانی کر رہی تھی جن کے بارے میں شک تھا کہ وہ سخی بٹ کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ ایک دن جواد اور اس کی چھوٹی بہن گڑیا اپنی سائیکلوں پر شام کی سیر کے لئے نکلے تو چند مشکوک افراد نے انہیں اغوا کر کے ایک محل نما عمارت میں پہنچا

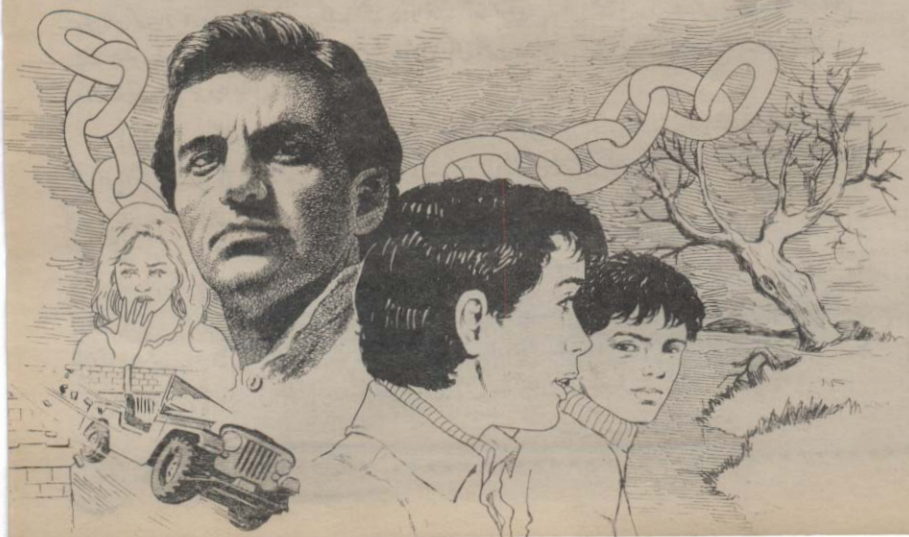

دیا۔ محل کے مالک کا نام پرنس احسن تھا۔

ذیشان اور اجلال، جواد کی تلاش میں سرگرداں تھے وہ شیدا پستول سے بھی ملے اور وہیں سے انہیں ایک پرچی ملی جس پر کوڈورڈز میں ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اجلال نے بڑی محنت سے اسے ڈی کوڈ کیا۔ مگر اس نمبر پر ایک پٹھان چوکیدار کے علاوہ کسی سے بات نہ ہو سکی۔ اسی دوران میں آغا عمران گھر میں داخل ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ جس مجرم کو انسپکٹر شعیب نے بڑی محنت سے گرفتار کیا تھا کسی نے حوالات کے اندر اسے قتل کر دیا ہے۔

پرنس احسن نے بالآخر جواد کو بڑی مشکل سے اپنے لئے کام کرنے پر راضی کر لیا۔ جواد نے اپنی چھٹی حس کی بدولت پرنس احسن کا لاکھوں روپوں کا مال با آسانی نکلوا دیا لیکن ذیشان نے اپنی ذہانت سے معلوم کر لیا کہ جواد پرنس احسن کے قبضے میں ہے اور اس کے لئے کام کر رہا ہے۔ ادھر جواد اپنی بہن گڑیا کے ساتھ پرنس احسن کے محل نما ٹھکانے سے سخت جدوجہد کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا لیکن ایک ٹرک ڈرائیور سے لفٹ لینے کے چکر میں پکڑا گیا۔ ٹرک ڈرائیور نے رومال سونگھا کر جواد اور گڑیا کو بے ہوش کر دیا اور تیزی کے ساتھ ٹرک چلا کر شیشے والے موڑ کی طرف چل پڑا۔ اسی اثناء میں ایک بس ٹرک کے قریب سے گزری۔ اس میں ذیشان اور اجلال بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے جواد اور گڑیا کو ٹرک میں چادر میں لپٹا دیکھ لیا۔

ٹرک آگے جا کر شیشے والے موڑ پر رکا۔ ایک خطرناک شکل و صورت والا آدمی جواد اور گڑیا کو لینے کے لئے جھاڑیوں سے برآمد ہوا مگر اس سے پہلے ہی اچانک وہاں پہنچنے والی جیپوں سے گولیاں برسنے لگیں اور ڈرائیور، کلینر اور وہ خطرناک آدمی موت کے منہ میں چلے گئے۔ جواد اور گڑیا اب دوبارہ اسمگلروں کی قید میں تھے۔ پولیس جائے حادثہ پر پہنچی تو دیگر مسافروں کے ساتھ ذیشان اور اجلال بھی وہاں موجود تھے۔ پولیس نے آوارہ گردی کے شبہ میں ان دونوں کو گرفتار کر لیا اور حوالات لے گئی جہاں انسپکٹر شیدا پستول کی وجہ سے وہ دونوں رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حادثے کی جگہ سے ذیشان کو جواد کا رومال ملا تھا جس پر ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ آغا عمران نے اس نقشے کی مدد سے محل پر چھاپہ مارا مگر ناکام رہے۔ جواد نے مجبوراً اسمگلروں کے لئے کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ ادھر مس نائلہ نے ذیشان کو فون پر اطلاع دی کہ وہ اسے ایک اہم خبر دینا چاہتی ہے۔

ذیشان نے نائلہ کو اپنے ہی گھر بلوا لیا۔ نائلہ نے اسے ایک انٹرنیشنل اسکول کے بارے میں بتایا جسے چند غیر ملکی چلاتے تھے۔ اس اسکول کے پرنسپل نے والدین کو بلا کر بچوں کو چند مخصوص برانڈ کی غیر ملکی ٹافیاں استعمال سے دور رکھنے کی ہدایت کی۔ ذیشان نے وہ ٹافیاں نائلہ سے لے کر آغا عمران کو دے دیں مگر انسپکٹر شعیب اس کہانی پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف جواد نے کسی نہ کسی طرح ایک خط ذیشان تک پہنچا دیا جس کی مدد سے ایک کوٹھی پر چھاپا مارا گیا مگر چھاپا ناکام رہا اور مجرم پہلے ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سب کام دراصل ڈی ایس پی علی اکبر کی غداری کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ وہ پرنس احسن سے ملا ہوا تھا اور اسی نے آغا عمران تک خط پہنچانے والے ڈاکیئے کو قتل کر دیا تھا۔ جب ڈی ایس پی علی اکبر نئے چھاپے کی پیشگی اطلاع دینے کے لئے پرنس احسن سے ملا تو جواد نے جو کہ موقع پر موجود تھا ایک ٹکٹ چالاکی سے علی اکبر کے کپڑوں پر چپکا دیا۔ نئی اطلاع کی روشنی میں پرنس احسن نے آغا عمران کے قتل کا حکم صادر فرما دیا تھا۔

اب آپ آگے پڑھئے

اجلال نے ذیشان کو آکر بتایا کہ ایک آدمی آغا صاحب سے ملنے آیا ہے۔ سادہ کپڑوں میں ہے لیکن کسی ایجنسی کا آدمی لگتا ہے۔ تھوڑی دیر تو وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا پھر آغا صاحب آئے اور اسے اپنے کمرے میں لے گئے۔

"تو اس کا مطلب ہے۔" ذیشان نے کہا "وہ کوئی اہم آدمی ہے اور کسی ضروری مسئلے پر ابو سے بات کرنے آیا ہے۔"

اجلال اور ذیشان دونوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ آغا صاحب سے جو شخص بھی ملنے آئے اس کی خاص نگرانی کی جائے اور اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کی جائیں۔ ذیشان نے اجلال کو اپنے کمرے میں بیٹھنے کے لئے کہا

"تم ادھر ہی بیٹھو میں دیکھتا ہوں وہ کون ہے؟ اور ابو سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟" ذیشان اپنے کمرے سے نکلا۔ ایک راہ داری سے ہوتا ہوا ڈرائنگ روم اور پھر آغا صاحب کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ باہر قطعی کوئی آواز نہیں آرہی تھی کہ اندر کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ اتنے میں ذیشان کو احساس ہوا کہ شاید دروازہ کھلنے والا ہے۔ ذیشان فوراً ہی سامنے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ دروازہ کھلا، آغا عمران اور وہ شخص باہر نکلے۔ ذیشان بھی ڈرائنگ روم سے نکل کر سامنے سے آنے لگا جیسے اب وہ اس سمت آرہا ہو۔ اور پھر ذیشان بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی چلنے لگا۔

"ہاں کیا بات ہے لڑکے؟" آغا عمران نے ذیشان سے پوچھا "ابو۔ وہ۔ میں نے ایک ضروری بات آپ سے کرنا تھی۔"

"ٹھیک ہے میں انہیں دروازے تک چھوڑ آؤں تو میں آپ سے بات کرتا ہوں۔"

"میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔" ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں بھی انہیں خدا حافظ کہہ دوں گا۔" آغا صاحب نے گھور کر ذیشان کی طرف دیکھا اور پھر مسکرائے جیسے کہہ رہے ہوں "ذیشان! تم بڑے شیطان ہو۔"

دراصل ذیشان اس آدمی کے کپڑوں پر ایک ٹکٹ چپکا ہوا دیکھ چکا تھا اور انتظار میں تھا کہ وہ شخص بازو اوپر کرے اور ذیشان کسی طرح وہ ٹکٹ اتار لے۔ آخر جب اس شخص نے آغا صاحب کو سیلوٹ کیا اور ہاتھ ملایا تو ذیشان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

اس شخص کو خدا حافظ کہہ کر آغا عمران نے ذیشان سے پوچھا،

"جی فرمائیے آپ کو مجھ سے کیا ضروری کام ہے؟"

"سر! معلوم کرنا تھا کہ یہ صاحب کون تھے؟"

"ضروری نہیں کہ ہر بات آپ کو بتائی جائے۔"

"ٹھیک ہے مجھے تھوڑا غور کرنے دیں۔"

ذیشان نے کہا "میں آپ کو بتادوں گا کہ یہ کون صاحب ہیں۔"

آغا عمران مسکرائے اور ذیشان دوبارہ اپنے کمرے میں آگیا۔ آتے ہی اس نے وہ ٹکٹ اجلال کے سامنے رکھ دیا۔ جس پر بڑا سا "ج" بنا ہوا تھا۔

"سو فیصد یہ تحریر جواد کی ہے اور یہ شخص وہاں سے ہو کر آیا ہے جہاں جواد موجود ہے۔"

اجلال حیرت سے ذیشان کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"ابو" ..... ذیشان چیختا ہوا اپنے کمرے سے نکلا اور دوبارہ آغا عمران کے پاس پہنچ گیا۔

"ابو ..... آپ کو بتانا ہو گا کہ وہ شخص کون تھا؟"

"لڑکے ..... اگر میں نہ بتاؤں تو؟"

"ابو پھر ایک بات میں بتا دیتا ہوں۔" ذیشان نے کہا۔ "وہ شخص آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

آغا عمران مسکرائے۔ "لو پھر سنو، یہ شخص پولیس میں ایک ذمہ دار آفیسر ہے، ڈی ایس پی علی اکبر!"

"اور آپ سے ملنے کیوں آیا تھا؟"

آغا عمران نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد بتایا کہ آج شام ہم ایک جگہ چھاپہ مارنے والے ہیں اور ڈی ایس پی علی اکبر اسی سلسلے میں ہدایات لینے آئے تھے۔"

"بالکل ٹھیک۔" ذیشان نے اجلال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اس کے پیچھے پیچھے وہیں آگیا تھا اور حیرت سے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

"تو اب میری سنئے، جب آپ وہاں چھاپہ ماریں گے تو وہ جگہ بھی حسبِ سابق آپ کو خالی ملے گی۔ آپ پوچھئے کیوں؟"

"چلئے میں پوچھ لیتا ہوں کیوں؟" اجلال نے کہا۔

"اس لئے کہ آپ کا ڈی ایس پی علی اکبر مجرموں سے ملا ہوا ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" ..... آغا عمران نے ناراضگی سے کہا۔ "اچھے پولیس آفیسر کبھی غصے میں نہیں آتے۔ گو یہ قولِ زریں کسی بڑے آدمی کا نہیں بلکہ بڑے آدمی کے بیٹے کا ہے۔" ذیشان نے شرارتاً کہا۔

"پھر بھی عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ آپ تحمل سے چھاپے کا انتظام کریں۔ میں آپ کی واپسی کا انتظار کرتا ہوں۔"

آغا عمران سخت جھلائے ہوئے اپنے دفتر میں بیٹھے تھے۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ڈی ایس پی علی اکبر واقعی اسمگلروں کے گروہ سے ملا ہوا تھا۔ ذیشان نے جس بنیاد پر اس کی نشان دہی کی تھی وہ سچ ثابت ہوئی تھی۔ آغا عمران سوچ رہے تھے۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکیے کا قتل بھی علی اکبر نے کیا ہو گا اور اس سے پہلے وہ لوگ جو پولیس لاک اپ میں مارے گئے ان کے پیچھے بھی ڈی ایس

پی علی اکبر کا ہاتھ ہو گا۔" انہوں نے اپنے سیکریٹری سے کہا کہ فوراً ٹیلی فون پر ایس ایس پی راؤ اقبال سے بات کراؤ۔

"دیکھیں میں آپ سے فوری ملنا چاہتا ہوں۔"

"خیریت؟" راؤ اقبال صاحب نے پوچھا۔

"بات یہ کہ مجھے ڈی ایس پی علی اکبر کے بارے میں ایک اہم فیصلے سے پہلے چند تفصیلات درکار ہیں۔ میرے خیال میں وہ..... !!"

آغا عمران کچھ کہتے ہوئے رک گئے۔

"ٹھیک ہے..... آپ اپنے دفتر میں انتظار کریں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"دیکھیں میں خود....." لیکن دوسری طرف سے فون منقطع ہو چکا تھا۔

اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد ایس ایس پی راؤ اقبال، آغا عمران کے دفتر میں موجود تھے۔

"آپ نے زحمت کی"..... آغا عمران نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "دراصل آج کوئی بھی وی آئی پی ٹائپ چیز شہر میں نہیں آرہی۔ اس لئے میرے پاس وقت تھا۔ ویسے آپ سے براہ راست ملاقات کئے بھی کافی دن ہو گئے تھے۔ یہ ایک فائل ہے۔" ایس ایس پی راؤ اقبال نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس آدمی کی خدمات میں نے ہی آپ کے کہنے پر آپ کے حوالے کی تھیں۔ میں خود بھی اسے چیک کرنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے چھوٹی چھوٹی شکایات تو تھیں مثلاً رشوت وغیرہ۔ کچھ جوئے کے اڈوں سے بھتہ بھی لیتا تھا۔ بے شمار مرتبہ لائن حاضر بھی کیا گیا ہے۔ میں نے خاص طور پر اس شخص کے بارے میں فائل کھولی تھی۔ آپ کو اس سے کیا شکایت ہوئی ہے۔"

آغا عمران نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے فائل دیکھتے رہے پھر انسپکٹر شعیب سے رابطہ قائم کیا۔

"لڑکے میں نے تمہیں ڈی ایس پی علی اکبر پر نظر رکھنے کے لئے کہا تھا۔"

"جی وہ اس وقت بھی میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم کچھ دیر اور اسے مصروف رکھو اور میری اس کال کے بارے میں کوئی بہانہ کر دینا یہی کہ اس کے ذمہ کوئی اہم کام لگایا جارہا ہے اس لئے اس کا پوچھا تھا۔"

آغا عمران نے ساری صورتِ حال سے ایس ایس پی راؤ اقبال کو آگاہ کیا اور ایس ایس پی صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے متعلقہ ایس پی کو ہدایات جاری کر دیں اور ڈی ایس پی علی اکبر کو تین قتل کے علاوہ اسمگلروں، ڈاکوؤں اور ملک دشمن عناصر کو خفیہ معلومات فراہم کرنے کے الزام میں گرفتاری کے آرڈر جاری کر دیئے۔

آغا عمران نے انسپکٹر شعیب سے کہا کہ میں ایک ایمرجینسی میٹنگ کرنا چاہتا ہوں۔ ایس ایس پی راؤ اقبال بھی اس میٹنگ میں ہوں گے۔

اس میٹنگ میں صرف ان افسروں کو بلایا جائے گا جو ہمارے موجودہ مشن میں ہمارے لئے کام کر رہے ہیں۔

انسپکٹر شعیب نے آغا عمران کے دفتر کے عملے کے تعاون سے وقت ضائع کئے بغیر میٹنگ کا بندوبست کر دیا۔ صرف ایس ایس پی راؤ اقبال نے میٹنگ سے معذرت کی کیونکہ انہیں کسی ملک کے سربراہ کی آمد کی وجہ سے فوری طور پر ایئرپورٹ جانا پڑ گیا تھا۔

میٹنگ شروع ہوئی تو ہر شخص ڈی ایس پی علی اکبر کے بارے میں جاننے کا خواہش مند تھا۔ آغا عمران نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ ڈی ایس پی علی اکبر کیس کی انکوائری میں نے ایس پی فاروقی کے حوالے کی ہے اور اب تک کی معلومات کے مطابق علی اکبر اپنے تمام تر گناہ قبول کر چکا ہے۔ جس میں ڈاکے سمیت تینوں قتل بھی شامل ہیں۔

تمام افسروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"جی میں آپ کا مطلب سمجھتا ہوں۔" آغا عمران نے کہا۔ایس پی فاروقی بھی ہماری آج کی میٹنگ میں موجود ہیں۔ علی اکبر پر کوئی تشدد نہیں کیا گیا بلکہ صرف نفسیاتی حربے استعمال کئے گئے۔"

بعد میں آغا عمران نے اس لائحہ عمل کی وضاحت کی جس کے تحت ان لوگوں کے گرد دائرہ تنگ کیا جائے گا جو ملک میں منشیات کا دھندا کرتے ہیں اور خاص طور پر بچوں کے کھانے پینے کی اشیا میں نشہ آور ادویات ملانے جیسے گھناونے کاروبار میں ملوث ہیں۔ آغا عمران نے مزید کہا کہ میں نے وزیر داخلہ اور سیکریٹری داخلہ سے ذاتی طور پر اجازت لے لی ہے اور ہمیں کچھ خاص اختیارات بھی دئے گئے ہیں۔ انہیں ہم وقت آنے پر استعمال کریں گے، بس اب ہمیں اپنے کام کا دائرہ پورے ملک تک بڑھانا ہے اور اس سلسلے میں تمام ڈپٹی کمشنرز صاحبان اور ایس پی صاحبان کو ہدایات جاری کی جا رہی ہیں۔

اس کے بعد آغا عمران نے افسران کے سوالوں کے جواب دیئے اور عملی اقدامات اٹھانے کے لئے اپنے ٹارگٹ طے کئے۔

○ ○ ○

مس نائلہ سخت پریشان تھی کیونکہ اس کے والد سخی بٹ نے اسے آج بہت ہی عجیب اور خوفناک خبر سنائی تھی اور وہ خبر یہ تھی کہ آغا عمران کی جیپ کو حادثہ پیش آگیا اور جیپ ایک پل پر سے لڑھکتی ہوئی دریا میں جا گری۔ جیپ کا ڈھانچہ تو مل گیا ہے لیکن آغا عمران کی لاش کی تلاش ابھی جاری ہے۔ مس نائلہ بار بار ذیشان کے گھر کا نمبر ڈائل کر رہی تھی لیکن دوسری طرف سے کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

مس نائلہ نے کئی بار اپنے والد سے ذیشان کے گھر جانے کی اجازت مانگی لیکن سخی بٹ صاحب نے

منع کر دیا کہ صبح چلی جانا، ممکن ہے خبر غلط ہو۔ وہ ساری رات یہی دعا مانگتی رہی کہ یااللہ یہ خبر غلط ہو لیکن صبح کی اخبار نے اس بات کی تصدیق کر دی۔ اخبار نے جیپ کی تصویر بھی شائع کی تھی اور خبر کی تفصیل بھی تقریباً وہی تھی جو اس کے والد نے اسے بتائی تھی۔ اخبار نے مزید لکھا تھا کہ چوبیس گھنٹے گزرنے کے باوجود آغا عمران کا پتہ نہیں چل سکا۔ پولیس ذرائع کا کہنا ہے کہ غالباً آغا عمران زندہ نہیں ہیں۔

(باقی آئندہ)

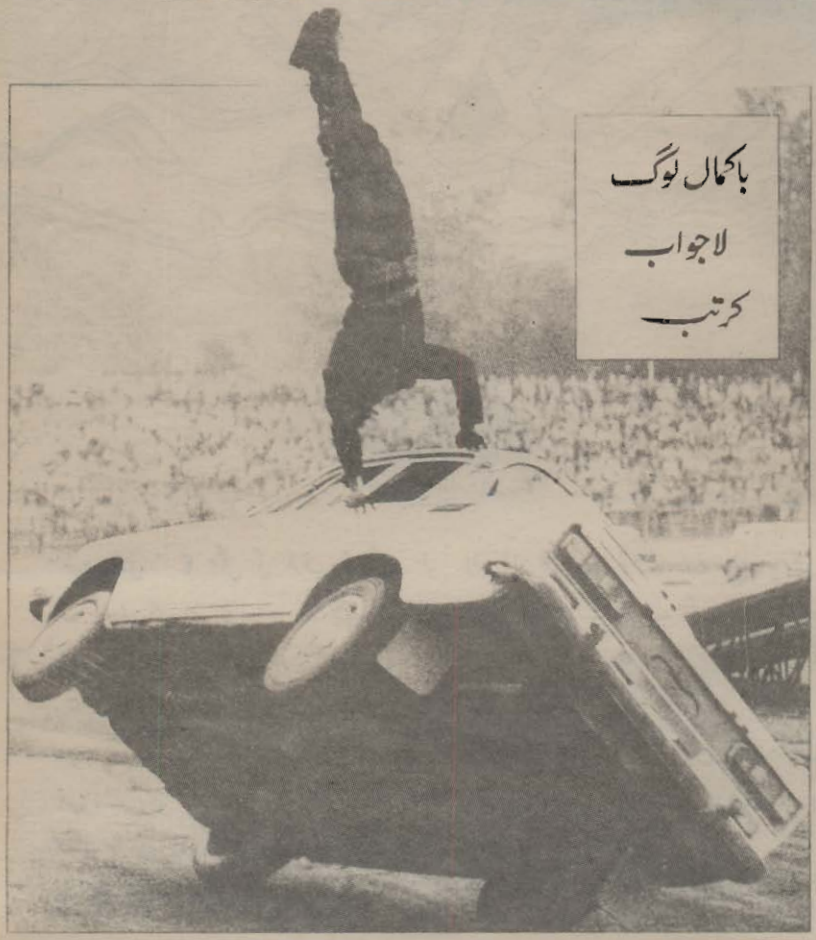

سونے کی اینٹیں

عبدالقادر

حضرت عیسیٰ ؑ کا جنگل کی طرف تھا اک سفر
زادِ راہ تھا ایک توشہ، لے چلے وقتِ سحر

اک یہودی بھی سفر میں ان کے پیچھے چل دیا
اس یہودی کے حوالے آپ نے توشہ کیا

روٹیاں اس میں رکھی تھیں حضرت عیسیٰ ؑ نے تین
اس یہودی کو بنایا ابن مریم ؑ نے امین

ورغلایا جب خیانت پر اسے شیطان نے
چپکے چپکے ایک روٹی کھائی اس نادان نے

دوپہر کو وہ رکے جنگل میں جب آرام کو
توشہ دیکھا کھول کر تو روٹیاں تھیں صرف دو

آپ نے پوچھا کہ "روٹی ایک کم کیسے ہوئی؟"
بولا "دو ہی روٹیاں تھیں، بھول حضرت سے ہوئی"

جھوٹ پر اس کے نہیں کی لب کشائی آپ نے
ایک روٹی دی اسے اور ایک کھائی آپ نے

پھر چلے آگے تو اینٹیں مل گئیں سونے کی تین
بیش قیمت، جگمگاتی اور صورت میں حسین

دولت دنیا سے کیا مطلب تھا روحؑ اللہ کو — مصلحت سے یہ کہا اینٹوں کی یوں تقسیم ہو
ایک میری اینٹ ہے، اور اینٹ تیری دوسری — تیسری ہے اس کی جس نے کھائی روٹی تیسری
جھٹ وہ پیغمبر سے بولا، ہوگئی مجھ سے خطا — میں نے کھائی تھی وہ روٹی، اینٹ ہو مجھ کو عطا
تینوں اینٹیں اس کو دے کر آپ نے اس سے کہا — "راہ تیری اب جدا ہے، راستہ میرا جدا"
تین اینٹیں لے کے فوراً وہ خوشی سے چل دیا — دوسری جانب پیمبرؑ نے رخ زیبا کیا
آپ کو تھی فکر عقبیٰ، وہ تھا دنیا پر نثار — جا رہا تھا وہ یہودی لے کر دنیا نابکار
چھ لٹیروں نے اچانک اس کو نرغے میں لیا — چھین کر سونے کی اینٹیں قتل اس کو کردیا
ہاتھ آئیں جب وہ اینٹیں، خوب وہ مسرور تھے — دولت دنیا کے ملنے پر بہت مغرور تھے
خوب رنگ رلیاں منائیں اور مے نوشی ہوئی — جشن جب برپا ہوا، حاجت مٹھائی کی ہوئی
تین ڈاکو چل دیئے لانے مٹھائی شہر سے — کردی آلودہ مٹھائی ظالموں نے زہر سے
کہہ رہے تھے "تین اینٹیں کیوں نہ ہم ہی بانٹ لیں — تین ساتھی ختم ہوں تو صرف ہم مالک بنیں"
بس یہی جنگل میں باقی تین کی سازش ہوئی — زہر پانی میں ملایا، قتل کی کوشش ہوئی
اس مٹھائی اور پانی میں جو شامل زہر تھا — وہ خدائے لم یزل کا ظالموں پہ قہر تھا
جب بدن میں زہر پہنچا، چھ سنگر مرگئے — تین کھا کر مرگئے اور تین پی کر مر گئے
حضرت عیسیٰ وہاں پہنچے تو دیکھا یہ سماں — تین اینٹیں اک طرف اور سات لاشیں تھیں وہاں
آپ نے اینٹوں سے فرمایا "اے دنیائے لعیںؑ — تو ہے عادت میں فریبی تو ہے خصلت میں کمیںؑ
تیری فطرت میں کہاں مہر و وفا کا نام ہے — جو ترا طالب ہے اس کا بس یہی انجام ہے"
اتنا فرما کر ہوئے پھر ایک جانب گام زن — رب سے ان کو تھی لگن، ذکر الٰہی میں مگن

یاد حق سے قلب روشن، ذکر ہی مرغوب تھا
ٹھوکروں میں تھے خزانے، بس خدا مطلوب تھا

(۱) وہ گھنا جو مسافر ساتھ لے کر جائے (۲) زاد راہ (۳) امانت دار (۴) بولنا (۵) حضرت عیسیٰؑ کا خطاب (۶) خوبصورت چہرہ (۷) آخرت (۸) نکما، بدذات، بے ہودہ (۹) ہمیشہ رہنے والا (۱۰) ظالم (۱۱) لعنتی (۱۲) کمینہ ذلیل (۱۳) محبت اور وفاداری۔

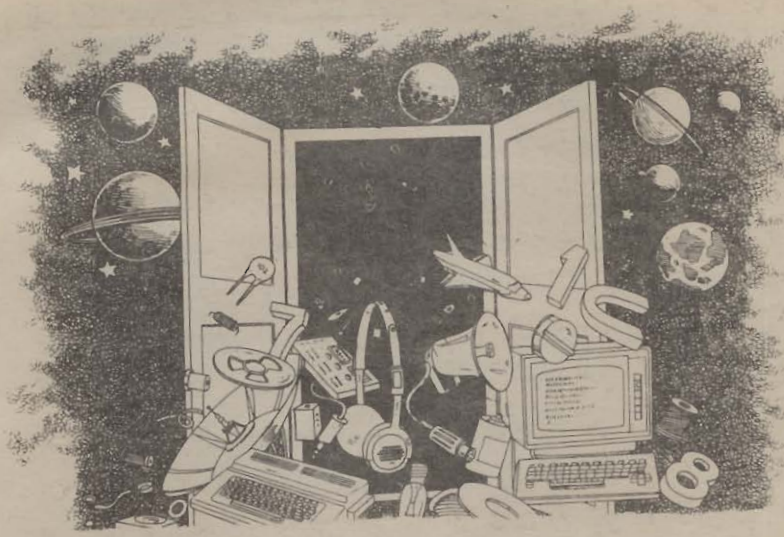

حیرت

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

ایاز محمود

لوہے کو زنگ کیوں لگتا ہے؟

اگر آپ لوہے کے ایک ٹکڑے کو کسی نم جگہ پر رکھ دیں تو کچھ دن کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ لوہے پر زنگ لگ گیا ہے اور یہ بالکل ایسا لگے گا جیسے کسی نے آکر لوہے پر رنگ کر دیا ہے۔ زنگ کیا ہے؟ اور یہ لوہے اور فولاد پر کیوں لگتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ زنگ دراصل آئرن آکسائڈ ہے۔ یہ پانی میں حل شدہ آکسیجن اور لوہے کے عمل سے بنتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک ہوا میں نمی نہ ہو جو آکسیجن کو اپنے اندر جذب نہ کرے زنگ لگنے کا عمل نہیں ہو سکتا جب بارش کا کوئی قطرہ کسی لوہے کی چمکدار سطح پر پڑتا ہے تو کچھ دیر تک وہ شفاف رہتا ہے مگر جلد ہی لوہا اور آکسیجن مل کر اپنا عمل شروع کر دیتے ہیں اور آئرن آکسائڈ یا زنگ بناتے ہیں۔ پانی کا وہ قطرہ سرخی مائل ہو جاتا ہے۔ زنگ پانی میں

معلق رہتا ہے کچھ دیر بعد پانی کا قطرہ تبخیر ہو جاتا ہے جب کہ زنگ لوہے کی سطح پر رہ جاتا ہے۔ زنگ لگنے کا عمل اگر ایک دفعہ شروع ہو جائے تو پھر خشک ہوا میں بھی چلتا رہتا ہے۔ کیونکہ زنگ ہوا میں موجود آبی بخارات کو اپنی سمت کھینچتا رہتا ہے۔ لہٰذا زنگ کو پھیلنے سے روکنے سے زیادہ اس کو شروع ہونے سے روکنا آسان ہے۔

سراب کیا ہے؟

موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ، میں کسی بھی سپاٹ سڑک پر جگہ جگہ پانی سا کھڑا نظر آتا ہے۔ اسے سراب کہتے ہیں یعنی فریبِ نظر۔

ہوتا یوں ہے کہ ہوا ایک خاص انداز سے گرم ہو جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ہوا کی گرم تہہ ٹھنڈی تہہ کے نیچے ہوتی ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے مقابلے میں گرم ہوا زیادہ ہلکی ہوتی ہے اور جب یہ ٹھنڈی ہوا کی تہہ سے گزرتی ہے تو اس تہہ سے گزرنے والی روشنی کی لہروں میں جھکاؤ پیدا کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی پانی کے برتن میں پینسل ڈال دیجئے تو پینسل کا وہ حصہ جو پانی میں ڈوبا ہوا ہے کچھ ٹیڑھا نظر آئے گا۔ روشنی کا یہ جھکاؤ فریب نظر پیدا کرتا ہے جس سے سڑک پر پانی کھڑا نظر آتا ہے اکثر یہ گمان بھی ہوتا ہے۔

سراب ریگستان میں بھی نظر آتے ہیں۔ ریت کے پھیلے ہوئے بڑے میدان میں جھیل نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی ان میں بڑے شہروں، کھجور کے درختوں اور نخلستان کا عکس نظر آتا ہے اور سراب ریگستان میں بھٹک جانے والے مسافروں کی پیاس کا مذاق اڑاتا ہے۔ سمندر پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے جب آسمان پر جہاز تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حقیقت اور سراب میں فرق معلوم کرنا بہت آسان ہے اس لئے کہ سراب میں چیزوں کا عکس الٹا نظر آتا ہے۔ یہ روشنی کی لہروں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

"روشن ستارہ" کیا ہے؟

کیا آپ نے کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر سب سے زیادہ چمکنے والے ستارے کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے؟ رات کے وقت ستاروں سے سجے ہوئے آسمان کو دیکھ کر آپ یہی سوچتے ہوں گے کہ ان بے شمار ستاروں کی گنتی ناممکن ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ جن ستاروں کو دوربین کی مدد کے بغیر دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً چھ ہزار ہے اور ان میں سے ایک چوتھائی بہت دور ہیں اور صرف شمالی امریکہ سے نظر آتے ہیں۔

پرانے زمانے میں سب سے پہلے ملک یونان کے ماہرین فلکیات نے ستاروں اور سیاروں کا مطالعہ شروع کیا۔ اس وقت سے اب تک ستاروں کو روشنی کے لحاظ سے مختلف درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ٹیلی اسکوپ کی ایجاد سے پہلے صرف چھ درجہ

روشنی تک کے ستاروں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ پہلے درجے کے ستارے سب سے روشن ہوتے ہیں اور چھٹے درجے کے ستارے سب سے مدہم ہوتے ہیں۔ اس آخری درجے کے روشن ستاروں سے کم روشنی والے ستارے ٹیلی اسکوپ کی مدد کے بغیر نہیں دیکھے جا سکتے۔ آج کل تو جدید ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ۲۱ درجے تک کی مدہم روشنی والے ستاروں کی تصاویر بھی اتاری جا سکتی ہیں۔

چمک کی بنیاد پر ستاروں کی درجہ بندی کچھ اس طرح ہے کہ روشن ستارے سے کم روشنی والے ستارے میں ڈھائی گنا چمک کم ہے۔ پہلے درجے میں صرف ۲۲ ستارے اور ان میں سب زیادہ روشن ستارہ "سیریس" ہے۔ جس کی چمک ایک درجے کی معیاری چمک سے بھی زیادہ ہے۔ اس طرح یہ ستارہ ہماری آنکھ سے نظر آنے والے سب سے مدہم ستارے سے ایک ہزار گنا زیادہ روشن ہے ہم جیسے جیسے ستاروں کی اس درجہ بندی میں نیچے کی طرف آتے ہیں ستاروں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پہلے درجے کی چمک والے ستاروں کی تعداد ۲۲ ہے جب کہ ۲۰ درجے کی چمک والے ستاروں کی تعداد ایک ارب (۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰) کے قریب ہے۔

نمی کیا ہے؟

اگر آپ برف کے پانی سے بھرا ہوا ایک جگ کھلی جگہ پر چند لمحوں کے لئے چھوڑ دیں تو کچھ دیر بعد آپ کو اس کی بیرونی سطح گیلی نظر آئے گی۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا ہوا کی وجہ سے ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہوا میں ہر وقت پانی کے بخارات کی صورت میں موجود رہتی ہے۔ پانی سے بھرے جگ کے سطح پر ہوا میں موجود یہ بخارات منجمد ہو کر ظاہر ہو گئے مگر ہوا میں موجود بخارات نظر نہیں آتے۔ اور لفظ "نمی" سے ہماری مراد ہوا میں پانی کے بخارات کی موجودگی ہے۔ نمی ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ موجود ریگستانوں کے اوپر بھی۔ مگر نمی ہمیشہ اور ہر جگہ ایک جیسی نہیں ہوتی ہے۔ نمی کو مختلف طریقوں سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سے دو "مطلق نمی" اور "اضافی نمی" ہیں۔ مطلق نمی ہوا کے اکائی حجم میں آبی بخارات کی تعداد کو کہتے ہیں یوں تو بخارات کے بے شمار ذرات ہوا کے ایک مربع فٹ میں موجود ہوتے ہیں مگر عملی طور سے ہمیں اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کو بتایا جائے کہ "چار ذرات فی مربع فٹ" تو اس سے آپ کو اندازہ نہیں ہو گا کہ ہوا خشک ہو گی یا نم۔

نمی کو فیصد میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ سو فیصد سے مراد ہے کہ ہوا مکمل طور سے آبی بخارات سے بھری ہوئی ہے۔ جتنا زیادہ درجۂ حرارت ہو گا ہوا میں اتنے ہی زیادہ آبی بخارات کو سمونے کی صلاحیت ہو گی۔!!

نقطے ملائیے۔ خرگوشوں کی دلچسپ حرکات سے لطف اٹھائیے

مٹلو کا مٹاپا

اگر آپ کھانے پینے میں احتیاط نہیں کرتے تو پھر یہ کہانی ضرور پڑھئے

ٹلو اور مٹلو دو بھائی تھے۔ دونوں میں بہت دوستی تھی۔ اکثر ان میں ہنسی مذاق ہوتا رہتا۔ مثلاً ٹلو کہتا

"ارے کم کھایا کرو مٹلو میاں! ورنہ غبارے کی طرح پھول جاؤ گے۔"

مٹلو بُرا ماننے کے بجائے کہتا۔ "سوکھی لکڑی کیوں جلتے ہو میری صحت سے، جان ہے تو جہان ہے۔"

بات کچھ یوں تھی کہ مٹلو کھانے کے معاملے میں نہایت پیٹو واقع ہوا تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ کاہل بھی تھا اور کھیلنے کودنے سے بھی پرہیز کرتا تھا۔

ابا جان لاکھ سمجھاتے، امی ڈانٹتیں، جب اس سے کہا جاتا کہ مٹاپا اچھی صحت کی نہیں بلکہ خراب صحت کی نشانی ہے اور یہ کہ اس کو بھوک رکھ کر کھانا چاہئے تو اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔

"میں تو پیدا ہی کھانے کے لئے ہوا ہوں۔" وہ سوچتا۔

مٹلو کے دوست اسے بتاتے کہ اس کے اچھی ہاکی نہ کھیلنے کی وجہ یہ ہے کہ مٹاپے کی وجہ سے وہ بھاگ ہی نہیں سکتا ہے اور پانچ ہی منٹ میں اس کا سانس پھول جاتا ہے۔ مٹلو نے جب یہ سنا تو اس نے زور سے کہا "چلو چھوڑو اب ہاکی کون کھیلے، چوٹیں بھی لگتی ہیں اور کپڑے الگ گندے ہوتے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ بستر پہ لیٹ کر کہانیاں پڑھی جائیں"۔

ٹلو اور مٹلو اپنے دوستوں کے ساتھ جب باغ کی سیر کو جاتے تو سب بچے تو بھاگ کر درختوں پر چڑھ جاتے مگر بھاری بھر کم مٹلو سے چڑھا نہ جاتا۔ ”مٹلو، پھسڈی۔“ سب دوست اس کا مذاق اڑاتے۔ مگر مٹلو کسی کی باتوں کا اثر نہ لیتا۔ ”ارے بھائی! باغ کا مالی آگیا تو تم سب پھنس جاؤ گے۔ میں تو بھاگ ہی جاؤں گا کسی نہ کسی طرح۔“ وہ کہتا۔

غرض یہ کہ مٹلو میاں سب باتوں سے بے پروا اپنی کھال میں مگن تھے کوئی انہیں زیادہ کھانے اور ورزش نہ کرنے کے نقصانات سے آگاہ کرتا تو وہ بہت آسانی سے سُنی اَن سُنی کر دیتے۔ مگر ایک دن مٹاپا ان کی جان کو آگیا۔

ہوا یوں کہ ایک رات دونوں بھائی، ٹلو اور مٹلو، اپنے کمرے میں بیٹھے اسکول کا کام کر رہے تھے کہ اچانک بجلی کے تاروں میں خرابی کی وجہ سے شعلے نکلنے لگے۔ آہستہ آہستہ آگ کمرے میں پھیلنے لگی۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں ہو گیا۔ دونوں بھائیوں نے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر بند دروازہ آگ کی تپش سے کچھ اس طرح جام ہو گیا تھا کہ زور لگانے پر بھی نہ کھلا۔ اب تو دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں سو وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ لے دے کر ایک روشن دان ہی رہ جاتا تھا۔ ٹلو نے میز پر اسٹول رکھا اور اس پر چڑھ کر غڑاپ سے روشن دان کے ذریعے باہر نکل گیا۔

اب مٹلو کی باری تھی۔ اسٹول پر چڑھنے میں اس نے بہت پھرتی دکھائی اور چاہا کہ وہ بھی ٹلو کی طرح باہر نکل جائے مگر روشن دان اس کے اندازے سے کچھ چھوٹا ثابت ہوا اور وہ اس میں اس طرح سے پھنسا کہ پھنسا کا پھنسا ہی رہ گیا۔

آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ادھر مٹلو کی یہ حالت تھی کہ آدھا روشن دان کے اندر اور آدھا باہر۔ اسی اثنا میں کسی نے کمرے سے دھواں نکلتے دیکھ کر فائر بریگیڈ کو اطلاع کر دی تھی۔ آن کی آن میں آگ بجھانے والی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی آموجود ہوئی۔ اس میں سے آگ بجھانے والا عملہ کود کے نکلا اور کمرے کا دروازہ توڑ کر مٹلو کی جان بچائی۔ اس دن پہلی بار مٹلو کو معلوم ہوا کہ موٹاپا کتنی خطرناک چیز ہے!

بے انصافی

○ ..... ایک امریکی نوجوان نے اپنے دوست سے کہا۔

”تمہیں میرے وہ چچا یاد ہیں؟ جو بہت مال دار تھے جن کی کوئی اولاد نہیں تھی اور جو بہت بیمار رہتے تھے۔“

دوست بولا ”ہاں یاد تو ہیں۔“

نوجوان بولا ”اب پولیس مجھے ان کے کفن دفن کا انتظام کرنے سے روک رہی ہے۔“

دوست نے پوچھا۔ ”مگر وہ کیوں؟“

نوجوان نے سبب بتایا۔ ”اس لئے کہ ابھی وہ مرے نہیں ہیں۔“

خریدار بنایئے
انعام پایئے

آنکھ مچولی مُلک کا مقبول ترین رسالہ ہے۔

اس کے قارئین کی رائے میں یہ ایک بے حد مفید اور معیاری رسالہ بھی ہے۔ ادارہ آنکھ مچولی نے اس رسالے کو گھر گھر پہنچانے کے لیے ایک نئی اسکیم شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آنکھ مچولی کے جو ساتھی آنکھ مچولی کے دس سالانہ خریدار بنائیں گے، اُنھیں ادارے کی جانب سے ایک ڈیجیٹل گھڑی تحفے میں پیش کی جائے گی ـــ

دس خریدار بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں، محلے اور اسکول میں ایسے دس ساتھی آپ ذرا سی کوشش سے تلاش کر سکتے ہیں۔

آگے بڑھیے

سالانہ خریدار بنایئے اور قیمتی انعام پایئے

نوٹ: اس اسکیم میں حصّہ لینے کے خواہش مند ساتھی مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھ کر اسکیم کی تفصیلات اور کوپن منگوا سکتے ہیں

ماہنامہ **آنکھ مچولی** ۔ ۱-پی آئی بی کالونی۔ کراچی ۵ — فون ۴۱۱۵۸۷

جو چپ رہا، وہ بچ گیا

محمد عثمان سلیم ..... لاہور

زبان کے بہت سے نقصانات ہیں اور ان سے بچنا بہت دشوار ہے۔ اور چپ رہنے سے بہتر کوئی تدبیر نہیں۔

ارشاد نبویؐ ہے، "جو چپ رہا وہ بچ گیا۔"

حضرت معاذؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "کون سا عمل افضل ہے"؟ آپؐ نے زبان مبارک منہ سے باہر نکالی اور اس پر انگلی رکھی (یعنی چپ رہنا)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص باتونی ہوتا ہے، اس کی گفتگو میں اکثر غلطی واقع ہوتی ہے اور وہ شخص گنہگار ہوتا ہے۔"

مندرجہ بالا حدیثوں سے ہمیں خاموش رہنے کی ہدایت کی وجہ معلوم ہوتی ہے اس لئے ہمیں فضول باتوں کے بجائے خاموش رہنا چاہئے۔

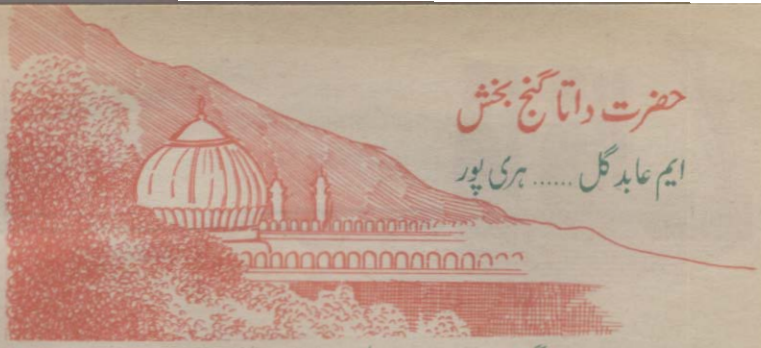

حضرت داتا گنج بخش

ایم عابد گل ..... ہری پور

حضرت داتا گنج بخشؒ کا پورا نام ابوالحسن علی تھا۔ آپ ۴۰۰ھ مطابق ۱۰۰۹ء کو غزنی کے قریب ایک گاؤں ہجویر میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے ہجویری کہلائے۔ آپ کی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے متعلق زیادہ معلومات میسر نہیں، لیکن آپ کی تصنیف "کشف المحجوب" سے آپ کی غیر معمولی علمی اور دینی استعداد کا پتا چلتا ہے۔ طریقت کی منزلیں طے کرنے کے لئے آپ نے آذربائی جان، خوزستان، بغداد، دمشق، طبرستان، ترکستان اور دوسرے اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ اس سفر میں آپ نے جید عالموں اور اہلِ نظر سے فیض حاصل کیا۔ ان میں القاسم قشیری، ابوسعید ابوالخیر، ابوالعباس اشقانی، ابوالقاسم گرکانی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد آپ نے لاہور آکر سکونت اختیار کی۔ یہ سلطان محمود غزنوی کا زمانہ تھا۔ لاہور میں آپ نے تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ اشاعتِ اسلام کا کام شروع کیا اور سینکڑوں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ان میں لاہور کا ایک راجہ بھی شامل تھا۔ تصوف اور علوم دینیہ میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ اور بابا فرید شکر گنجؒ جیسے ولیوں نے آپ کے مزار پر چلہ کشی کی اور سلوک کی منزلیں طے کیں۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ جب اعتکاف پورا کر کے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے یہ شعر پڑھا جو، اب لوحِ مزار پر کندہ ہے۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

آپ نے ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء کو وفات پائی۔ آپ کا مزار لاہور میں بھاٹی دروازے کے باہر مغرب کی جانب ہے۔ ہر سال ۱۹ اور ۲۰ صفر کو آپ کا عرس منایا جاتا ہے، جس میں لاکھوں، عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔

وہ رات

اعجاز حسین کراچی

مجھے مچھلی کے شکار کا بہت شوق ہے۔ میرے ابو اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر سندھ کے اندرونی علاقوں میں جھیل سے مچھلیاں پکڑنے جاتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ میرے ابو اکیلے جارہے تھے تو میں بھی ضد کرنے لگا۔ ابو نے مجھے بہت سمجھایا، مگر میں نہ مانا بالآخر میں ابو کے ساتھ رات آٹھ بجے گھر سے روانہ ہوا اور بس نے تقریباً پانچ گھنٹے میں ہمیں مطلوبہ مقام پر پہنچا دیا۔

ابو نے جھیل کے کنارے پہنچنے کیلئے کچی سڑک کے بجائے پگڈنڈی کا راستہ اختیار کیا۔ تھوڑا آگے جاکر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، کھیتوں میں پانی کی وجہ سے جگہ جگہ کیچڑ پیدا ہوگئی تھی۔ اسی کیچڑ کی وجہ سے میرا پاؤں پھسلا اور میں گر پڑا۔ میرے پاؤں میں چوٹ لگی تھی، اب مجھ سے چلا نہیں جارہا تھا۔ ابو نے مجھے کندھے پر اٹھالیا اور چلنے لگے۔ کھیتوں کی حفاظت کے لئے کسانوں نے کتے چھوڑ رکھے تھے۔ ان کتوں نے ہم پر بھونکنا شروع کردیا۔ یہ کتے عام کتوں کی نسبت کافی بڑے تھے۔ اسی اثنا میں چند اور کتے آگئے اور آپس میں لڑنے لگے۔ اس طرح ہماری ان سے جان چھوٹی۔ ہمیں ان کتوں سے چھٹکارا ملا تو آگے ایک سانپ پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ ابو نے مجھے کندھے سے اتارا اور سانپ کو بید سے مارنے لگے، مگر سانپ تھا کہ مر کر نہیں دیتا تھا۔ سانپ کو ادھ مرا چھوڑ کر ہم وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کیچڑ کی وجہ سے ہمیں بھاگنے میں مشکل ہوئی اور ہم کئی بار گر پڑے، اوپر سے میرے پیر میں الگ چوٹ لگی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دور جاکر ہمیں احساس ہوا کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ بس اسٹاپ سے جھیل کے کنارے تک آدھ گھنٹے کا راستہ تھا مگر ہمیں ڈھائی گھنٹے ہوگئے تھے اور منزل کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ اب ہم دونوں نے "درود شریف" "قل ھواللہ" غرضیکہ جو کچھ آتا تھا، پڑھ ڈالا۔ ہمارا تھکن سے برا حال تھا۔ بہت دور ہمیں روشنی کی کرن نظر آئی۔ ہم بے اختیار اس کی طرف دوڑ پڑے مگر راستے میں خاردار جھاڑیاں تھیں، "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق ہم نے انہیں پار کرنے کی ٹھان لی۔ رات کو سو قسم کے جانور، کیڑے مکوڑے، سانپ، بچھو ان میں رہتے تھے۔ ہم ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھتے جارہے تھے۔ کانٹوں کی وجہ سے جسم پر جگہ جگہ خراشیں آگئی تھیں۔ ہم دونوں نے جیسے تیسے جھاڑیاں پار کرلیں، تھوڑا آگے چلے ہوں گے کہ مجھے ہاتھ پر کچھ چلتا ہوا محسوس ہوا۔ اچانک اک ٹیس سی بازو پر محسوس ہوئی، میں نے فوراً ہاتھ جھٹک دیا، مگر درد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، لگ رہا تھا جیسے کوئی گرم گرم سلاخ چبھو رہا ہو۔ میرا تکلیف سے برا حال تھا۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ ہم دونوں کا تھکن کے مارے برا حال ہوچکا تھا۔ ابو نے مجھے کندھے پر ڈالا اور روشنی والے گھر کے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے ایک بزرگ سا آدمی آیا، اس نے ہماری یہ حالت دیکھی، تو فوراً اندر جاکر اپنی بیٹی کو اٹھایا اور اور کھانا پکانے کا کہہ کر حکیم کو لینے چلا گیا۔ صبح صادق کے تقریباً ۴ بجے ہوں گے، حکیم صاحب آئے، انہوں نے زخموں کی مرہم پٹی کی اور بتایا کہ بازو پر بچھو نے کاٹا ہے۔ وہ مرہم لگا کر چلے گئے، اتنے میں کھانا تیار ہوگیا۔ ہم لوگوں نے سیر ہوکر کھانا کھایا اور دوسرے دن ہم نے شام کو روانگی کے وقت اپنے محسن کو تین سو روپے انعام میں دینے چاہے تو اس نے منع کردیا اور ناراض ہوا اور ہم کو بیل گاڑی میں بس اسٹاپ تک چھوڑنے بھی آیا۔ اب ہم دونوں کو کافی آرام مل چکا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے محسن کا بہت شکریہ ادا کیا اور گھر واپسی کے لئے وہاں سے روانہ ہوئے۔

آج بھی میں یہ واقعہ یاد کرتا ہوں تو بے اختیار سارا منظر آنکھوں میں کھنچ آتا ہے اور میں جھٹ مچھلی کے شکار سے توبہ کرنے لگتا ہوں۔

..... ○○○ .....

آرزو

صوفیہ غزل

کاش کہ میں پنچھی بن جاؤں
اڑ کر میں اس پار کو جاؤں
دیکھوں امن کا اک گہوارہ
ہو وہ پیارا ملک ہمارا
پیار ہی پیار ہو ملک میں اپنے
پورے ہوں وہ سارے سپنے
پورے ہوں وہ خواب ہمارے
ہم جیتے ہیں جن کے سہارے
کاش غزل یہ خواب ہوں سچے
معمارِ وطن ہوں ملک کے بچے

کل اور آج

مرسلہ: محمد ارشد، چک نمبر ۳

ماضی میں ڈاکٹر مریضوں کا معائنہ کرتا تھا لیکن آج کل مریض کی جیب کا معائنہ کرتا ہے۔ کل تک لوگ لیمپ کی روشنی میں پڑھ کر نام روشن کیا کرتے تھے لیکن آج لوگ بلب کی روشنی میں پڑھ کر لندن، دوبئی اور امریکہ میں برتن صاف کرتے ہیں۔ کل کے والدین اپنے بچوں کے نام مسلمان مجاہدوں کے ناموں پر رکھتے تھے مگر آج کے والدین فلمی اداکاروں کے نام پر رکھتے ہیں۔ کل کا استاد بچوں کو ریاضی کا کورس مکمل کرواتا تھا مگر آج وہ صرف ایک کلیہ دیتا ہے کہ۔

نقل ضرب عقل برابر موقع مساوی ہے پاس۔

$$\text{پاس} = \frac{\text{نقل} \times \text{عقل}}{\text{موقع}}$$

چور مینا

محمد عزیز، کراچی

پرانے زمانے کی بات ہے، مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب کا راجہ تھا۔ ایک دفعہ اس کے زمانے میں لاہور میں اس بات کا بڑا شور مچا کہ عورتوں کے زیور خود بخود غائب ہو جاتے ہیں۔ کسی عورت کے کان کی بالی غائب، کسی نے منہ دھوتے وقت ناک سے لونگ اتار کر رکھی تو غائب، کسی نے ناک کی کیل اتاری اور خود گھڑی بھر کے لئے اندر گئی تو کیل ہی گم۔ بڑھتے بڑھتے یہ حالت یہاں تک پہنچی کہ ہر روز کسی نہ کسی محلے میں عورتوں کے زیورات چوری ہونے لگے۔

چند دنوں میں ایسا طوفان اٹھا کہ لوگ کوتوالی میں حاضر ہو کر چیخ و پکار کرنے لگے کہ دن دہاڑے چیزیں غائب ہو جاتی ہیں اور کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جہاں چوری ہوتی تھی وہاں کسی غیر آدمی کا آنا ثابت ہی نہ ہوتا۔ اندر سے اگر مکان کو قفل لگا رکھا ہے یا سیڑھیوں کے دروازے کو بند کیا ہوا ہے، اس کے باوجود زیورات غائب ہو جاتے۔ یہ حالت چھ ماہ تک رہی۔ شہر میں اس بات کا چرچا تھا، عورتوں کے چھوٹے چھوٹے زیورات پراسرار طریقے سے چوری ہو جاتے ہیں، لیکن پھر بھی بے پروا سیدھی سادی عورتیں لونگ، کیل، انگوٹھی، چھلا اتار کر گھر میں رکھ دیتی تھیں اور وہ فوراً غائب ہو جاتے، پتا نہیں کہاں چلے جاتے؟

بعض لوگوں کی رائے تھی کہ جن بھوت چرا کر لے جاتے ہیں، جبکہ کچھ کا کہنا تھا کہ زیور جادو کے ذریعے چوری ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں لاہور میں شہباز خان کوتوال تھا۔ یہ شخص قصور کا رہنے والا تھا۔ اس کا ماتحت ارجن سنگھ تھا جو بہت ذہین تھا۔ عام طور پر پیچیدہ مقدمات جن کا سراغ لگانا مشکل ہوتا، تفتیش کے لئے ارجن سنگھ کو سپرد کئے جاتے تھے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے کوتوال صاحب ارجن سنگھ سے کہنے لگے، "دیکھ لی آپ کی لیاقت، آپ چور کا سراغ نہیں لگا سکتے۔" یہ سن کر ارجن سنگھ نے کہا، "حکم کی دیر ہے، دیکھئے کس طرح گرفتار کر کے لاتا ہوں۔"

عقلمند ارجن سنگھ نے سب سے پہلے ان مکانوں کا معائنہ کیا، جہاں سے زیور چوری ہوئے تھے۔ سب زیورات ہلکے وزن کے تھے۔ ارجن سنگھ سوچنے لگا، "چور انسان نہیں،

یہ کوئی اور ہی مخلوق ہے۔" اسی فکر میں غرق وہ بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ روٹی چھت سے گراتا ہے اور مینا اسے گرنے سے پہلے پکڑ لیتی ہے اور اپنے مالک کے پاس لے آتی ہے۔ ارجن سنگھ کا پہلے ہی یہ خیال تھا کہ اس قسم کی چوریاں انسان نہیں کر سکتا، یہ کسی اور مخلوق کا کام ہے۔ چنانچہ فوراً دماغ اس طرف متوجہ ہوا کہ ہو نہ ہو، کوئی جانور چور ہے جو چھوٹے چھوٹے زیورات جہاں پڑے ہوں، اٹھا کر مالک کے پاس لے آتا ہے۔ گتھی حل ہوتے ہی وہ ہر شخص کی نگرانی کرنے لگا۔ ایک دن ایک شخص کو پنجرہ ہاتھ میں لئے ہوئے دیکھا، جس پر غلاف چڑھا ہوا تھا اور وہ شخص ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ ارجن سنگھ کو شک ہوا، وہ اس کے پیچھے لگ کر نگرانی کرنے لگا۔ دوسرے ہی دن اس نے دیکھا کہ چونے منڈی کی گلی میں جا کر اس شخص نے ادھر ادھر تاکا اور جب وہاں کسی کو موجود نہ پایا تو پنجرے کا غلاف تھوڑا سا اٹھا دیا۔ ایک پرندہ نکلا اور اڑ کر باہر چلا گیا۔ یہ شخص گلی میں ٹہلنے لگا، ارجن سنگھ بھی تاک میں تھا، کوئی دس پندرہ منٹ کا عرصہ گزرا ہو گا کہ وہی پرندہ چونچ میں انگوٹھی پکڑے ہوئے جھٹ اس شخص کے ہاتھ پر آ بیٹھا اور اس نے انگوٹھی جیب میں ڈال کر جانور کو پھر پنجرے میں بند کر دیا اور کوئی کھانے کی چیز اس کو دے دی۔ ارجن سنگھ یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ اس کو جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی تھی۔ جب یہ مجرم موتی بازار سے گزر رہا تھا تو ارجن سنگھ نے اسے پکڑ لیا۔ اس کی تلاشی لی تو دو انگوٹھیاں، تین لونگیں اور دو چھلے برآمد ہوئے۔ ارجن سنگھ اس کو کوتوال کے پاس لے گیا اور پنجرہ کھول کر توال کے پاس رکھ کر کہا..... "جناب! اس پنجرے میں آپ کا چور موجود ہے، جس نے کئی مہینوں سے شہر میں آفت مچا رکھی ہے اور یہ جو شخص پاس کھڑا ہے یہ اس کا مالک ہے۔" کوتوال نے اس شخص سے دریافت کیا تو اس نے اپنے مکان کا پتا بتایا جہاں سے ایک گھڑا انگوٹھیوں، چھلوں اور سونے کی کیلوں وغیرہ کا برآمد ہوا۔ مجرم نے بتایا کہ "میں نے اس مینا کو سکھا پڑھا کر چور بنایا تھا، جہاں سونے کی کوئی کم وزن والی چیز پڑی دیکھتی، اٹھا لاتی۔" اس گرفتاری سے کوتوال اور شہر کے لوگ بہت خوش ہوئے اور ارجن سنگھ کو معقول انعام ملا۔ مجرم کے دونوں ہاتھ کٹوا دیئے گئے اور مینا کو شاہی چڑیا خانے میں بھیج دیا گیا اور اس کے پنجرے پر لکھ دیا گیا، "چور مینا۔" جو بھی اسے دیکھتا چور اور سراغ رساں کی چالاکی پر حیران ہوتا۔

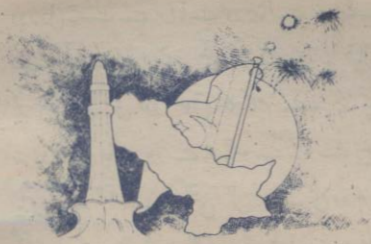

وہ ملک رہے گا پائندہ

محمد شاہد فیروز

وہ ملک رہے گا پائندہ
وہ ملک رہے گا تابندہ
جس ملک کا اللہ والی ہے
قرآن کا جس پر سایہ ہے

جس قوم کے لوگ جیالے ہیں
جو آن پہ مرنے والے ہیں
یہ چشمِ فلک نے دیکھا ہے
اس قوم نے رتبہ پایا ہے

جو محنت کرتے ہیں ہر پل
جو کام کو جانے ہیں اوّل
ہر دور میں جیت ہوئی ان کی
یہ وقت نے ہی سمجھایا ہے

جو حق کی راہ پہ لڑتے ہیں
جو حق کی راہ پہ مرتے ہیں
وہ زندہ ہیں پائندہ ہیں
قرآن نے یہ فرمایا ہے

بڑے لوگ

محمد شاہد عبدالغفور، میرپور خاص

دوپہر کا وقت تھا، غضب کی گرمی پڑ رہی تھی، سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ سب اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ امیر لوگ اپنے ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں اور غریب لوگ اپنے کچے پکے گھروں میں۔ ایسی ہی گرمی میں ایک گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں چار لڑکے محوِ گفتگو تھے۔ "آخر ہم اپنی پہاڑ جیسی گرمیوں کی چھٹیاں کیسے گزاریں؟" کاشف نے کہا، "بھئی جیسے گزارتے ہیں۔" "اس دفعہ تو ساجد اور ماجد بھی آئے ہیں۔" کاشف کے بھائی کامران نے اپنے خالہ زاد بھائیوں کی طرف اشارہ کیا، "تمہارا مطلب گھومنے پھرنے اور پکنک وغیرہ منانے سے تو نہیں؟" ماجد نے اسے گھورا، "ہاں ٹھیک سمجھے۔" کامران نے جواب دیا۔

"لیکن میری بات سنو میں اس دفعہ کی چھٹیاں کسی خاص کام میں صرف کرنا چاہتا ہوں۔" کاشف نے کہا، "مثلاً کون سا کام؟" ملی جلی آوازیں آئیں۔ "کوئی بھی بھلائی کا کام۔" "ہم سب تم سے متفق ہیں۔" سب ایک ساتھ بولے۔ "پھر سوچو کیا کریں؟" سب سوچنے میں مصروف ہوگئے۔ پندرہ منٹ بعد ماجد نے سر اٹھایا اور کہا، "کیوں نہ ہم یتیم بچوں کے لئے فنڈ جمع کریں اور یتیم خانوں کو دیں۔" "ہاں یہ ٹھیک ہے۔" کاشف بولا۔ "ہمیں بھی منظور ہے۔" ساجد اور کامران بھی بولے۔ "مگر ہم اپنی اس ٹیم کا نام کیا رکھیں؟" کاشف بولا۔ "نام وغیرہ کا

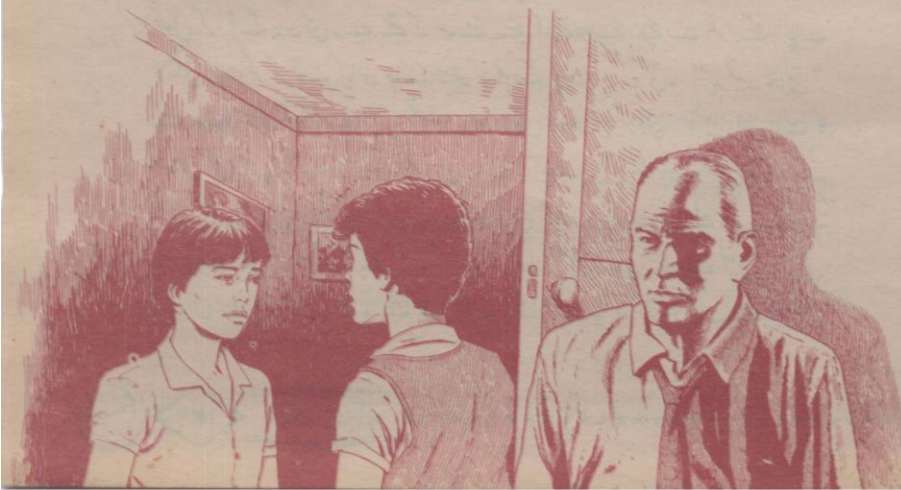

کیا فائدہ؟" ساجد نے کہا۔ "پھر بھی نام رکھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ میرے خیال میں چونکہ یہ خیال ماجد کا تھا، اس لئے ٹیم کا نام "ماجد اینڈ کو" ٹھیک رہے گا۔" "یہ مناسب ہے۔" سب ایک ساتھ بولے۔ "سب سے پہلے ہم اپنے جیب خرچ کے پیسے جمع کریں۔" اگلے دن ہی ماجد اس شہر کے مشہور آدمی سیٹھ کریم کے پاس گیا، کوٹھی تلاش کرنے میں دیر نہ لگی، شاندار طرزِ تعمیر کی یہ کوٹھی شہر کی سب سے خوبصورت کوٹھی تھی۔ ماجد نے دروازے پر لگی بیل کا بٹن دبایا، ایک منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک بچہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے باہر نکلا۔ "جی فرمایئے!" بچہ بولا۔ "مجھے سیٹھ کریم صاحب سے ملنا ہے۔" ماجد نے کہا، "اچھا جی۔" یہ کہہ کر بچہ اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد ماجد کوٹھی کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا، ہر چیز سے دولت مندی ٹپک رہی تھی، پانچ منٹ بعد ایک موٹا سا آدمی اندر داخل ہوا۔ "السلام علیکم" ماجد یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ "وعلیکم السلام، جی فرمایئے، کیا کام ہے؟" اس کے جواب میں ماجد نے پوری تفصیل بتا دی۔

"بہت خوب، آپ جیسے بچے اگر اسی طرح سوچنے لگے تو پھر یہ ملک بہت ترقی کرے گا، آخر یتیم بھی بچے ہی ہوتے ہیں۔ انہیں بھی ہر چیز ملنی چاہئے۔ یہ ان کا حق ہے۔" سیٹھ کریم نے خوش ہو کر کہا اور میز پر رکھی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بچہ اندر داخل ہوا۔ "جاؤ بہترین قسم کی چائے لاؤ اس کے بعد سیٹھ کریم نے دراز کھولی اور ہزار روپے کا چیک کاٹ کر ماجد کو دے دیا۔ "شکریہ، بہت بہت شکریہ جی۔ اب میں چلتا ہوں۔" ماجد نے سیٹھ صاحب سے اجازت چاہی۔ "ارے بھئی چائے تو پیتے جاؤ۔" "نہیں میں جلدی میں ہوں۔" "اچھا ٹھیک ہے۔" سیٹھ کریم ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ سامنے سے آتے ہوئے بچے سے ٹکرا گئے، چائے کا قیمتی سیٹ گر کر ٹوٹ گیا اور چائے سیٹھ کریم کے کپڑوں پر گر گئی۔ "بدتمیز، نالائق" کہتے ہوئے سیٹھ کریم نے اس پر تھپڑوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں رہا کہ ماجد ان کی باتیں سن رہا ہے۔ اچانک ان کی نظر ماجد پر پڑی اور وہ رک گئے، انہیں احساس ہوا کہ ماجد کو یہ روپ پسند نہیں آیا۔ دوسرے ہی لمحے ماجد نے جیب سے چیک نکال کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا "ہمیں آپ کے پیسے نہیں چاہئیں، آپ ان سے اپنا ٹی سیٹ خرید لیجئے گا۔ شکریہ۔!!" اور یہ کہہ کر وہ گیٹ سے باہر نکل گیا۔

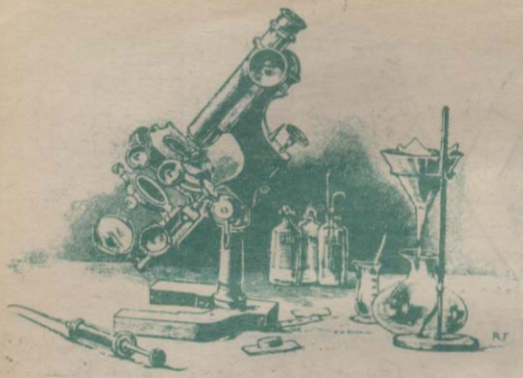

دماغ لڑائیے!

مہوش سکندر

۱۔ بحری جہاز کا موجد کون تھا؟
۲۔ ٹائپ رائٹر کس نے ایجاد کیا؟
۳۔ نیوزی لینڈ کے دارالحکومت کا کیا نام ہے؟
۴۔ عقاب ایک گھنٹے میں کتنے میل اڑ سکتا ہے؟
۵۔ ٹماٹر پھل ہے یا سبزی؟
۶۔ دنیا میں کل کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں؟
۷۔ انسائیکلوپیڈیا کس زبان کا لفظ ہے؟

جولیات ..... (۱) فلٹن۔ (۲) ہومر تھامس۔ (۳) ولنگٹن۔ (۴) پھل۔ (۵) ۱۲۵ میل۔ (۶) ۲۹۲ زبانیں۔ (۷) یونانی زبان کا۔

دانا وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سنے۔
کمزور پر ہاتھ اٹھانا بہادری نہیں ہے۔
دشمن بھی بھوکا ہو تو اسے بھی روٹی کھلاؤ۔
سچائی انسان کو بے خوف بنا دیتی ہے۔
صحت اور بیماری کے لئے ایک دروازہ ہے ..... منہ ..... اسے ہمیشہ صاف رکھو۔

اولمپک ہیرو

شہزاد حاجی عثمان گوہر

"ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ جس طرح آج کل اسپین میں اولمپک ہو رہے ہیں بالکل اسی طرح ۱۹۴۰ء میں جرمنی میں اولمپک ہو رہے تھے۔ کیا رونقیں تھیں۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی کیا عالم تھا؟ واہ واہ۔" ہم نے آنکھیں موند کر مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم اس وقت وہاں موجود تھے۔" ذیشان پھر بولا۔

"افسوس ..... صد افسوس۔" ہم نے اداس لہجے میں کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟ خیر تو ہے۔" ذیشان حیرت سے بولا۔

"خیر ہی تو نہیں۔" دنیا جہاں کی بے چارگی ہمارے چہرے پر سمٹ کر رہ گئی تھی۔

"کچھ بولو گے بھی یا یونہی حیرت کا اشتہار بنے رہو گے؟" کاشف نے جل کر کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ اولمپک گیم آگئے ہیں ....."

"تمہیں کیا پوری دنیا کو یہ معلوم ہے۔" ذیشان نے بات کاٹی۔

"ارے پوری بات تو سنتے نہیں اور بیچ میں ٹپک پڑتے ہو۔" ہم بگڑ گئے۔

کاشف نے فوراً صلح کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اوہو! چھوڑو بھی ..... ہاں تم کچھ کہہ رہے تھے؟"

"ہم نہیں تھے تو کیا ہوا؟ ہمارے دادا تو اس وقت موجود تھے وہاں پر۔" ہم اکڑ سے گئے۔

"اچھا اچھا یار تم واقعہ سناؤ۔" کاشف بے زاری سے بولا۔

"ہاں تو ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ اس وقت کے اولمپک میں ہمارے دادا نے پاکستان کی نمائندگی کی تھی۔ اتفاق یہ کہ ہمارے دادا پاکستان کی نمائندگی کرنے والے واحد کھلاڑی تھے اور دلچسپ یہ کہ ہمارے دادا نے سب سے زیادہ یعنی دس تمغے جیتے تھے۔" ہماری گردن مزید اکڑتی جارہی تھی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ تمہارے دادا نے یہ تمغے کس گیم میں حاصل کئے تھے؟" ہم نے دیکھا کہ کاشف بمشکل ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"احمق!" ہم نے دل میں سوچا اور اس کی اس حرکت کو نظر انداز کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "انھوں نے یہ تمغے ہاکی، کرکٹ اور فٹبال میں حاصل کئے تھے۔"

"کیا.....؟" ذیشان تقریباً چیخ پڑا۔

"اوہو! تمہیں نہیں معلوم کہ ۱۹۴۰ء میں یہ کھیل صرف ایک کھلاڑی سے کھیلے جاتے تھے۔"

کاشف نے ذیشان کو کہنی ماری (اور شاید آنکھ بھی)۔

"اور نہیں تو کیا۔" ہم پھول گئے۔

"اچھا ایک بار پھر سے تو بتاؤ کہ یہ گیم کب اور کہاں ہوئے تھے؟" کاشف نے شرارت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"۱۹۴۰ء میں جرمنی میں" ہم کہاں چپ رہتے۔

"جناب عالی! آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ۱۹۴۰ء میں دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے اولمپک گیم منعقد ہی نہیں ہوئے اور جرمنی تو پوری دنیا کا دشمن بنا ہوا تھا۔ رہا سوال پاکستان کی نمائندگی کا تو پاکستان اس وقت آزاد ہی نہیں ہوا تھا۔" ذیشان نے گویا ہمارے جھوٹ کی پول کھولتے ہوئے اطلاع دی۔

"کیا.....؟" ہمارا منہ پھٹے کا پھٹا رہ گیا۔

"اور میاں یہیں پر بس نہیں بلکہ....." اس سے پہلے کہ کاشف کچھ بولتا ہم وہاں سے ایسے بھاگے کہ اگر خرگوش سے بھی ریس لگاتے تو جیت جاتے۔

خیر بات یہیں پر ختم ہو جاتی تو کچھ نہیں تھا۔ دوسرے دن جب ہم گھر سے باہر نکلے تو آوازیں آرہی تھیں۔

"وہ دیکھو! ۱۹۴۰ء کے اولمپک ہیرو جارہے ہیں۔"

موسم گرما کی تعطیلات کی وجہ سے "بے سروسامانی" کی حالت میں "ہاتھ پر ہاتھ دھرے" بیٹھے "خیالی پلاؤ" پکانے میں مصروف تھے کہ یکایک ہمارے دوست موت کے فرشتہ کی طرح آموجود ہوئے اور انہیں دیکھتے ہی ہمارا "منہ بن گیا" لیکن ان کو "ہاتھوں ہاتھ لینا" پڑا۔ کیونکہ ان کے ہاتھ میں ہمارا پیارا آنکھ مچولی کا "دل دل پاکستان نمبر" تھا، جسے دیکھ کر ہمارا "دل اچھل کر حلق میں آگیا" اور ہم اس سے شمارہ لینے کے لئے جھپٹ پڑے (جیسے بلی چوہے کو دیکھ کر جھپٹتی ہے) لیکن وہ بھی کسی ماہر جمناسٹک کی طرح اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور ہم صوفے کو لیتے ہوئے فرش پر جا پڑے اور ہمیں "دن میں تارے نظر آگئے" ہم نے اسے لاکھ مرتبہ "خدا کا واسطہ" دیا، لیکن ہمارے دوست نے اس وقت بالکل "طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں" اور ہمیں پورے گھر میں "بندر کا ناچ نچوایا" تھوڑی دیر میں پورا گھر کسی "کباڑخانے" کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہمارا دوست ہمیں منہ چڑاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا اور ہم اپنی "قسمت کو کوستے" ہوئے "ہاتھ ملتے رہ گئے۔"

لیکن "ہم بھی کسی سے کم نہیں" تھے۔ فوراً ہی ہماری عقلِ شریف میں (گھر والوں کی رائے کے مطابق "عقل ہم میں نہیں ہے") یہ بات آگئی کہ کیوں نہ ہم خود ہی رسالہ خرید لائیں۔ "چاروناچار" ہم نے گھر سے پیسے جیب میں ڈالے اور "جیسے تیسے" بک اسٹال کی طرف چل پڑے۔

ہم اس وقت سڑک پر "پھونک پھونک کر" قدم رکھ رہے تھے کیونکہ سڑک پر "جابجا" کیچڑ اور گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ آخر بڑی "بھاگ دوڑ" کے بعد بک اسٹال تک پہنچے۔ بک اسٹال پر لوگوں کا بے انتہا ہجوم تھا اور "تل دھرنے کی بھی جگہ" نہ تھی۔ اتنا ہجوم دیکھ کر ہمارا "اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے" رہ گیا۔ ہم نے اپنا سانس بحال کیا کیوں کہ آخر ہمیں رسالہ بھی خریدنا تھا۔

چنانچہ "ایڑی چوٹی کا زور" لگا کر ہم ہجوم میں گھس گئے لیکن بڑی جدوجہد کے باوجود بھی بک اسٹال کی "گرد کو بھی نہ چھو" سکے۔ اسی جدوجہد میں مصروف تھے کہ ایک زوردار قسم کا دھکا لگا اور ہم "دودھ میں سے نکال پھینکی گئی مکھی کی طرح" اڑتے ہوئے سڑک پر

"چاروں شانے چت" جا گرے۔ ابھی ہمارے "حواس بھی پوری طرح بحال" نہ ہوئے تھے کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک موٹر سائیکل بڑی تیزی سے دوڑتی ہوئی قریب پڑے ہوئے گندے پانی میں سے گزری اور سڑک کا سارا گندہ پانی ہم پہ انڈیل گئی۔ ابھی یہ قیامت کیا کم تھی کہ ہم پر لیک اور "آسمان ٹوٹ پڑا" کیونکہ ہماری قمیص سے جیب اس طرح غائب تھی جیسے "گدھے کے سر سے سینگ" مگر دوسری طرف ہمارا لباس بھی "تار تار" ہوچکا تھا اور ہم کیچڑ میں لتھڑے ہوئے کسی "کوہ قاف کے جن" کی طرح لگ رہے تھے۔

"چارو ناچار" ہم دوبارہ گھر کی طرف کسی "شکست خوردے" کی طرح چل پڑے۔ ابھی ہم نے اپنی اپنی گلی میں ایک قدم ہی رکھا تھا کہ نجانے کہاں سے ایک گلی کا کتا نکل آیا اور ہم پر بھونکتا ہوا دوڑ پڑا۔ ہم بھی تیزی کے ساتھ دوڑے اور اسی "دوڑ دھوپ" میں ہم سامنے سے آتی ہوئی کار کو نہ دیکھ سکے اور کار سے بڑی زور سے ٹکرا گئے اور پھر ہماری "آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا" گیا۔ ہم "غش کھا کر" گر پڑے۔ اور جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم اسپتال میں تھے اور ہمارا پورا جسم پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہماری ٹانگ صاحبہ کسی "قصائی کے گوشت" کی طرح ہمارے پلنگ سے ڈیڑھ فٹ اوپر لٹکی ہوئی تھی۔

لیکن ہم دوسرے ہی لمحہ "چونکے بغیر نہ رہ" سکے۔ کیونکہ سامنے ٹیبل پر ہماری جان "آنکھ مچولی" رکھا ہوا تھا۔ پھر کیا تھا، ہم کسی "زخمی چیتے کی طرح" رسالہ پر جھپٹ پڑے لیکن صرف ہائے کر کے رہ گئے۔ کیونکہ ہمارے جسم نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور ہم "خون کا گھونٹ" پی جانے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

سکہ

برطانیہ	لندن	پونڈ	۷ بجے صبح
ترکی	انقرہ	لیرا (پونڈ)	۹ بجے صبح
جاپان	ٹوکیو	ین	۴ بجے شام
اسپین	میڈرڈ	پیسٹا	۸ بجے صبح
سعودی عرب	ریاض	سعودی ریال	۱۰ بجے صبح

دنیا کے بلند و بالا پہاڑ

جہاں زیب افضل حق، حیدرآباد

پہاڑ یا چوٹی کا نام	سلسلہ (جس میں واقع ہے)	بلندی فٹ کے حساب سے
۱۔ ماؤنٹ ایورسٹ Everest	ہمالیہ Himalayas	29,028 feet
۲۔ گوڈین آسٹن Goowin Austen	قراقرم Karakoram	28,250 feet
۳۔ کان چن جنگا Kanchen junga	ہمالیہ Himalayas	28,146 ft
۴۔ نان دا دیو Nanda Devi	ہمالیہ Himalayas	25,645 ft
۵۔ قامت Kamet	ہمالیہ Himalayas	25,447 ft
۶۔ منایا کونکا Minya Kanka	چین Chiena	24,900 ft
۷۔ پک کمیونیزما Pik Communizma	پامیر Pamirs	24,590 gy
۸۔ پک پوبیدی Pik Pobedy	تائین شان Tien Shan	24,406 ft
۹۔ اکون کیوگوا Aconcagua	اینڈس Andes	22,835 ft
۱۰۔ اوجوس ڈلسلاڈو Ojas Delsaldo	اینڈس Andes	22,572 ft
۱۱۔ ہوسکرون Huascaran	ہمالیہ Himalayas	22,538 ft
۱۲۔ للولیل لاکو	اینڈس Andes	22,205 ft
۱۳۔ ساراٹا Sarata	اینڈس Andes	22,057 ft
۱۴۔ لی مانے Leamani	اینڈس Andes	21,276 ft
۱۵۔ ہنڈوائے Haunday	اینڈس Andes	21,184 ft
۱۶۔ چمبورازو Chimborazo	اینڈس Andes	21,088 ft
۱۷۔ میکینلے Mackiley	الاسکا Alaska	20,577 ft
۱۸۔ ماؤنٹ لوگان Mount Logan	یوکون Yukon	20,320 ft
۱۹۔ کونٹو پیکسی Conto Pani	اینڈس Andes	19,850 ft
۲۰۔ نارتھ (شمالی) پیک North Peak	الاسکا (امریکہ) Alaska	19,498 ft

گوڈین آسٹن کو K-2 بھی کہا جاتا ہے۔

MAGGI®
"mmm... Maggi!"
2-MINUTE NOODLES
MAGGI®
2-MINUTE NOODLES
CHICKEN
FAST TO COOK! GOOD TO EAT!
FAST TO COOK! GOOD TO EAT!

تازہ خالص
کھرا مصالحہ
اس کا شیدا گھر بھر سارا
احمد
چٹنی اور اچار
PRESERVES IT
AHMED
PICKLE
Mixed in Oil
AHMED
PLUM
CHUTNEY
AHMED
PICKLE
قدرت نے ذائقہ دیا۔ احمد نے محفوظ کیا